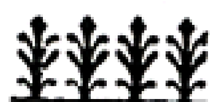
حقیقتِ تصوّف

جلد اوّل

ڈاکٹر محمد طاہر القادری

حقیقتِ تصوّف

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری



منہاج القرآن پبلی کیشنز لاہور
مرکزی سیکرٹریٹ ۳۶۵ ایم ماڈل ٹاؤن

نام کتاب	حقیقت تصوف جلد اول
خطبات	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
تخریج و نظر ثانی	مولانا محمد نواز ظفر
تبویب	علی اکبر قادری
پروف ریڈنگ	محمد علی قادری
اشاعت بار اول	ستمبر ۱۹۹۰ء (دو ہزار)
اشاعت بار دوم	اکتوبر ۱۹۹۲ء (۲ ہزار)
اشاعت بار سوم	اگست ۱۹۹۵ء (۲ ہزار)
اشاعت بار چہارم	جولائی ۱۹۹۷ء (گیارہ سو)
اشاعت بار پنجم	مئی ۹۹ء (گیارہ سو)
اشاعت بار ششم	نومبر ۲۰۰۰ء (گیارہ سو)
قیمت	۱۰۰ روپے

نوٹ: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی تمام تصانیف اور خطبات و تقاریر کے ریکارڈ شدہ کیسٹوں سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے تحریک منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

ڈائریکٹر پریس اینڈ پبلیکیشنز



مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ
مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْنِ
وَالْفَرِيْقَيْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ

گورنمنٹ آف پنجاب کے نوٹیفیکشن نمبر ایس او (پی ۔۱) ۴۔۱/۸۰ پی آئی وی مورخہ ۳۱ جولائی ۸۴، گورنمنٹ آف بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷۔ ۴۔ ۲۰ ای جنرل وایم ۴/ ۹۷۰۔ ۳۔ ۷ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء، شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۱۔ ۶۷۔۶۷ این ۔۱/۱ اے ڈی (لائبریری) مورخہ ۳۰ اگست ۸۶ء اور آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر مظفر آباد کی چٹھی نمبر س ت / انتظامیہ / ۶۳۔۸۰۶۱ / ۹۲ مورخہ ۲ جون ۹۲ء کے تحت پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب ان صوبوں میں تمام کالجوں اور سکولوں کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

موضوع سے متعلق چند
افتتاحی کلمات

اللہ تعالیٰ نے انسان کو روح اور جسم کے دو مختلف عناصر کا مجموعہ بنا کر اس کی سرشت میں فطری طور پر دونوں قسم کی ضرورت کا داعیہ رکھ دیا ہے جس طرح جسم کی بقا و سلامتی کے لئے مادی ضروریات کا حصول ضروری ہے اسی طرح روح بھی ایک مخصوص خوراک اور ماحول کا تقاضا کرتی ہے۔ انسان کے لئے اس دنیا میں دونوں اقسام کی ضروریات کی تکمیل کا قدرتی نظام موجود ہے جسم کی خوراک خورد و نوش' لباس' رہائش اور دیگر ضروریات زندگی کے لئے قدرتی وسائل موجود ہیں اور روح کی خوراک عبدیت کے تقاضوں کی تکمیل ہے جس کے لئے انبیائے کرام کے ذریعے اللہ تعالیٰ مکمل اصول و ضوابط مہیا فرماتا رہا۔ حتی کہ حضور سید عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور قرآن حکیم کی صورت میں انسانیت کو ایک واضح نصب العین عطا کیا۔ اسلام نے روح اور جسم کے تقاضوں میں مضمر فوائد و نقصانات کو بھی واضح کر دیا۔ پھر انسان کو عقل' تدبر اور تفکر کی نعمت سے نواز کر اسے پورا پورا اختیار دیا کہ روحانی اور جسمانی ضروریات اور تقاضوں کی تکمیل میں جسے چاہے اولیت دے۔

اب چاہئے تو یہ تھا کہ انسان عقل سلیم کو استعمال میں لاتے ہوئے روح اور جسم کے مطالبات میں توازن برقرار رکھتا اور دونوں کو مطلوبہ خوراک اور ماحول فراہم کرنے میں انصاف کرتا۔ مگر چونکہ جسمانی مفادات اور نفسانی خواہشات و داعیات انسانی طبیعت کے لئے بظاہر زیادہ مرغوب اور باعث لذت و سکون ہیں۔ اس لئے وہ مادی ضروریات کے لئے نسبتاً زیادہ مائل رہتا ہے۔ انسان کی مادیت پرستی کا دوسرا بڑا سبب شیطان کا جمالیاتی فریب ہے جو ازلی دشمنی کے باعث مستقل محرک کی حیثیت سے اس کے رگ و ریشے میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن روح بہر حال ایک رحمانی قوت ہے' ایک میلان اور نورانی جذبہ ہے جو انسان کو وقتاً فوقتاً نیکی اور صالحیت کی طرف کھینچتی

ہے۔ مذہب اگر معاشرتی اقدار کا محرک ہو تو انسان کو روحانی غذا ملتی رہتی ہے۔ لیکن مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور پورا معاشرہ ہی مادیت کے طوفان کی بھینٹ چڑھ جائے تو روحانیت دبتی چلی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے لئے خیر و شر، نیکی اور بدی کے سارے فرق ختم ہو جاتے ہیں۔ آج انسانیت اسی موڑ پر کھڑی ہے۔ اس وقت انفرادی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر مادیت پرستی نے انسان سے خیر و شر کے تمام امتیازات چھین لئے ہیں۔ جدید ترقی یافتہ مغربی دنیا نے جس قدر سائنسی ترقی کی ہے اسی قدر بے راہ روی اور بدکاری کی مرتکب ہو کر اخلاقی قدریں کھو چکی ہے۔ یہاں تک کہ آج کا پڑھا لکھا نام نہاد مہذب انسان حیوانات سے بدتر اخلاقی معیار پر پہنچ چکا ہے۔ سامان تعیش کی فراوانی اور عیش و عشرت کے باوجود لوگ پریشان ہیں۔ انہیں ذہنی سکون نہیں ملتا۔

یہ تو اہل یورپ اور اہل مغرب کی بات تھی جہاں اب برائی نے عروج پر پہنچ کر انسان کو سوچنے سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے اور بہت سے لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور اسلام کے روحانی نظام کو بہ دل و جان تسلیم کرتے ہوئے صوفیائے اسلام کی کتب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے آج کا مسلمان خود یورپ کی نقالی کر رہا ہے جس تہذیب نے اہل مغرب کو مفلوج اور بے حس کر دیا اسی تہذیب کو اہل اسلام ایک دوسرے سے بڑھ کر گلے لگا رہے ہیں۔ بے دینی، بددیانتی، ضمیر فروشی، ہوس مال و زر اور اس سے بڑھ کر اخلاقی بے راہروی جیسے اثرات پوری طرح اسلامی سوسائٹی میں جڑیں پکڑ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان انفرادی زندگی کی سطح سے لے کر قومی اور بین الاقوامی سطح تک باہمی منافرت، بے عملی، بے یقینی اور شکست خوردگی کا شکار ہیں۔ دنیا کی امامت کے لئے بھیجی جانے والی امت آج سراسر بے مقصدیت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

یہی وہ حالات ہیں جن کے پیش نظر آج مذہبی طبقوں اور بالخصوص تبلیغ دین کے عظیم منصب پر فائز علماء و مفکرین کو اپنی اہم ذمہ داریوں کا احساس پہلے سے بڑھ کر

کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ایک طرف مغربی اقوام کی تباہ کاریاں' ان کا احساس ندامت اور نتیجۃً اسلام کے نظام روحانیت کی طرف گہرا رجحان اور دوسری طرف خود اس روحانی نظام کے حاملین کی عملاً مذہب سے بغاوت و سرکشی اور بے عملی دو ایسے مختلف رخ ہیں جن پر غور فکر کرنا ہر صاحب درد مسلمان کا اولین فرض ہے۔

اس وقت تغیر پذیر عالمی' سیاسی' سماجی' ثقافتی اور اقتصادی حالات و واقعات ملت اسلامیہ کے لئے امتحان کی گھڑی ہیں۔ مغرب میں آج بے چینی' لاقانونیت' اخلاقی پستی اور بدکاری کا بڑھتا ہوا طوفان اپنے عروج کی جن سطحوں کو چھو رہا ہے۔ اس کے اثرات نے اسلامی معاشرے کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ہمارے نوجوان بری طرح اس ثقافتی یلغار کا شکار ہو رہے ہیں اور عالم کفر امریکہ جیسی بے اصول شیطانی سپر طاقت کے زیر اثر پروان چڑھ رہا ہے۔

ان تمام داخلی اور خارجی ہتھکنڈوں کا واحد مقصد یہ ہے کہ بیسویں صدی کے بطن سے شعوری سطح پر جنم لینے والی عالمی اسلامی تحریک کو منتشر کیا جائے جو مسلمانوں کے دل کی آواز ہے اور انشاء اللہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ایسے نازک مواقع تاریخ اسلام میں کئی بار آئے جب کفر والحاد اور فسق و فجور کی سیاہ گھٹاؤں نے عالم اسلام کی فضا کو خوفناک حد تک گھمبیر کر دیا۔ لیکن اسلام چونکہ دین الٰہی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ہر دور میں اپنے دین کو محفوظ کرنے کے انتظامات فرماتا ہے۔ حفاظت دین پر مامور ہونے والے خوش نصیب لوگوں میں سے اکثریت طبقہ صوفیاء کی رہی ہے جنہوں نے ہر باطل کا ہر سطح پر ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسلام کی گرتی ہوئی ساکھ کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ یہ اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دشمنان اسلام بھی اس سے انکار کی جرات نہیں کر سکتے۔ پروفیسر ایچ۔ آر گب جیسے یورپی دانش ور کے یہ الفاظ اس سلسلے میں خاص طور پر قابل غور ہیں:

"تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا لیکن اس کے باوجود مغلوب نہ ہو سکا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کا انداز فکر فوراً

اس کی مدد کو آجاتا تھا اور اس کی اتنی قوت و توانائی بخش دیتا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی" (Islamic Culture Printed1942.P-265)

اسی طرح عصر حاضر کے معروف اور عظیم سائنس دان ڈاکٹر مارس بیوکائی کا یہ اعتراف بھی ناقابل فراموش ہے جو اس نے تہذیب مغرب کی تباہ کاریوں کے پیش نظر انسانیت کے مستقبل کے متعلق تنبیہہ کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب "بائبل' قرآن اور سائنس" میں کیا لکھتے ہیں:

"موجودہ سائنس (کے تحت ہونے والی مادی ترقی) نے انسانی دماغوں کو جس قدر ناپاک کر دیا ہے ان کو پاک کرنے کے لئے بڑی روحانی قوت کی ضرورت ہے اور وہ اسلام کی تعلیمات سے ہی حاصل ہو سکتی ہے"

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا روحانی نظام یعنی تصوف ہی موجودہ سائنس کی طرح انسان کو روحانی مشاہدات تک پہنچا کر اسے عین الیقین اور حق الیقین کے درجہ پر فائز کر سکتا ہے اور مادیت زدہ ناپاک باطن اسی سے پاکیزگی کی نعمت سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ مگر انتہائی قابل افسوس امر یہ ہے کہ اس پاکیزہ اور موثر روحانی تعلیمات پر مبنی نظام (تصوف) کے ساتھ خود مسلمانوں نے دو انتہاؤں میں بٹ کر ظلم کیا۔ ان انتہاؤں میں بٹے ہوئے مسلمانوں کو اگر دو طبقے کہا جائے تو ان میں سے:

- پہلا طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو سرے سے اسلام کے روحانی نظام کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ وہ بیک جنبش قلم تصوف کو عجمی تصور کہہ کر دائرہ اسلام سے خارج کر دینے کو ہی اسلام کی حقیقی خدمت سمجھتے ہیں اور حتی المقدور صوفیائے اسلام کی ناقابل فراموش خدمات کی مختلف تاویلیں کر کے انہیں شرک کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ فقہی مذاہب اربعہ (حنفی' شافعی' حنبلی' مالکی) کی طرح سلاسل طریقت کے مختلف مکتبہ ہائے فکر (قادری' نقشبندی' چشتی' رفاعی' سہروردی وغیرہ) کی تقسیم کو بھی اسلام کے خلاف "گھناؤنی سازش" قرار دیتے ہیں۔
- اس کے برعکس دوسرا طبقہ ان جاہل' بے عمل اور نام نہاد صوفیاء کا ہے جنہوں نے

خانقاہی نظام کو بدنام کرنے میں بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا علم و عمل سے فارغ ایسے کاروباری پیر آج ہر روپ میں ہر جگہ بکثرت پائے جاتے ہیں جو تصوف و طریقت کے پاکیزہ مشن کو باقاعدہ تجارتی دھندا سمجھتے ہوئے حصول شہرت و زر کی اعلیٰ منازل طے کر چکے ہیں۔ اس وقت بے شمار گدی نشین الا ماشاء اللہ ایسے ہیں جو اقبالؒ کے مصرع "رہ گئے مجاور خانقاہوں میں یا گورکن" کے حقیقی مصداق ہیں اور اکثر صاحبزادگان پر 'زاغوں کی تصرف میں عقابوں کے نشیمن' کی حقیقت فٹ آتی ہے۔

مذکورہ بالا پہلا باغی طبقہ دراصل ایسے ہی بے عمل 'گنوار اور جاہل' "صوفیاء" کا ہی ردعمل ہے۔ دنیا و آخرت سے بے خبر یہ لوگ دراصل نفس پرستی کے جال میں گرفتار ہیں اور مادی دوڑ میں شریک دوسرے تمام طبقات سے زیادہ طریقت کے نام پر دین کے ساتھ منافقت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

برصغیر میں ان دو طبقات کے علاوہ ایک تیسرا طبقہ بھی موجود ہے جو تصوف کے تاریخی کارناموں سے انکار تو نہیں کر سکتا اور اس نظام کو کسی قدر برحق بھی سمجھتا ہے مگر عملاً صوفیائے اسلام کی تعلیمات سے نہ جانے کیوں الرجک ہے۔ ان میں سے بعض مفکرین کے نزدیک آج تصوف افیون یا ذیابیطس کی بیماری ہے جس سے قوم کو نجات دلانا ضروری ہے۔

حقیقت تو خیر حقیقت ہی ہوتی ہے اس کے لئے کسی کا انکار یا اقرار تصدیق کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مگر آج جامد خانقاہیت ظواہر پرستی اور نفس پرستی پر مبنی 'پیری مریدی' نے اسلام کی روح کو جتنا نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا ازالہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ عملی تصوف کو روحانی تربیت کے ذریعے جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے متعارف کرایا جائے تاکہ اس دور زوال میں امت مسلمہ کو پھر سے رازی' غزالی' رومی' جیلانی' ہجویری' مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ رحمھم اللہ اجمعین جیسے مردان حق میسر آ سکیں۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر اس وقت تجدید و احیائے دین اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت جیسی غیر معمولی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے والے افراد اور

اداروں کو وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اسلام کی پیاسی اور روحانی سکون کے لئے ترستی ہوئی انسانیت کو اسلام کے چشمہ صافی تک پہنچانے کا فریضہ پوری دیانت اور خلوص سے سرانجام دینا چاہئے۔

عالمی اسلامی انقلاب کی عظیم منزل کی طرف رواں دواں تحریک منہاج القرآن دراصل ایک روحانی تحریک ہے۔ اس تحریک کی عمارت کو جن چار فکری ستونوں پر استوار کیا گیا ہے ان میں سے پہلا ستون تعلق باللہ ہے اور بانی و قائد تحریک منہاج القرآن پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے بقول تصوف ہی وہ واحد طریقہ تعلیم و تربیت ہے جو عملی طور پر اس مادیت زدہ ماحول میں عبد کا تعلق اپنے الہ سے قائم و دائم رکھ سکتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ صوفیائے اسلام کا طریقہ ہی وہ صحیح طریقہ ہے جو تمام ابلیسی و مادی خطرات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تصوف شریعت محمدی سے ہٹ کر کوئی الگ نئی چیز نہیں بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ کے بقول

"جس طرح دین کے تمام اعمال کی ایک ظاہری شکل ہے اور ایک اس کی باطنی حقیقت۔ ظاہری شکل کے بغیر باطنی حقیقت کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور باطنی حقیقت کے بغیر ظاہری شکل ایک بے جان جسم کی طرح ہے۔ بس یونہی دین کی ظاہری شکل کا تعلق شریعت سے ہے اور باطنی حقیقت کا تعلق طریقت یا تصوف سے"

قائد تحریک منہاج القرآن پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے دعوتی مرحلے کے آغاز ہی سے جس طرح اجزائے ایمان اور ارکان اسلام کے فلسفہ و حکمت پر خطبات جمعہ کا بصیرت افروز سلسلہ شروع کیا اسی طرح شادمان میں درس قرآن کے ساتھ ساتھ دروس تصوف کی کلاس کا باقاعدہ اجراء فرمایا۔ اس سطح پر یہ ایک نیا اور تاریخی تجربہ تھا جسے حسب توقع لوگوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس وقت تک ملک اور بیرون ملک ہزاروں لاکھوں لوگ آڈیو ویڈیو کیسٹوں کی صورت میں ان خطبات و دروس تصوف سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ ان گنت حضرات پہلے عنی سنائی باتوں کی وجہ سے تصوف سے گریزپا تھے اب اس کی عصری اہمیت کو تسلیم کر چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب "حقیقت تصوف جلد اول" میں ان دروس تصوف میں سے ابتدائی چھ مرتب دروس شامل ہیں اور ابتدا میں مقدمہ کے عنوان سے تین فصلوں میں قائد محترم کے اس تحقیقی مقالے کے بعض بنیادی، فکری نوعیت کے حصص شامل ہیں جو انہوں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اسلامیات کے امتحان میں پیش کیا تھا۔ مجموعی طور پر یہ پہلی جلد تصوف کے عمومی مطالعہ اور اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

فطری ہٹ دھری اور تعصب کا علاج تو کسی کے پاس بھی نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تصوف پر بے بنیاد اعتراض کرنے والوں کی تشفی کے لئے اس وقت اس سے بڑھ کر کوئی کتاب اتنی مستند اور مدلل نہیں جس میں عصر حاضر کے معروضی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کے روحانی نظام کی اہمیت کو اس قدر واضح کیا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اسلام کی پاکیزہ روحانی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

خاک پائے صلحاءؒ

علی اکبر قادری

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۱۱ھ (۱۰ جنوری ۹۱ء)

○

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ کا ارشاد

○

وہ ہمارے گروہ میں سے نہیں جس نے کتاب اللہ پر غور نہ کیا ہو اور نبی کریم ﷺ کی احادیث میں فہم و بصیرت حاصل نہ کی ہو۔ وہ ہم میں سے نہیں جس نے ایسے علماء کی صحبت ترک کر دی ہو جو صوفیاء ہیں اور انہیں کتاب و سنت میں درک ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو ایسے اصحاب علم سے کنارہ کش ہو گیا ہو جو تصوف میں بہرہ رکھتے ہوں اور ایسے محدثین کی صحبت میں نہ بیٹھے جو محدثین کے ساتھ فقہا بھی ہوں۔ وہ ہم میں سے نہیں جس نے ایسے فقہاء کی صحبت ترک کر دی ہو جو علم حدیث بھی جانتے ہیں۔ باقی رہے جاہل صوفیاء اور جاہل علماء جو تصوف کا انکار کرتے ہیں تو دونوں کے دونوں چور اور رہزن ہیں اور ان سے بچنا چاہئے۔

(شاہ ولی اللہ کا فلسفۂ نفسیات اور تصوف: ۴۹)

پروفیسر ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کا ارشاد

میں نے دس سال مجاہدہ کے لئے خلوت گزینی اختیار کی۔ اسی خلوت کے دوران مجھ پر ایسے امور کا انکشاف ہوا جس کا احاطہ و اندازہ ممکن نہیں لیکن امور نافعہ جن کا تذکرہ یہاں ضروری ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجھے اس بات کا یقین ہوگیا کہ صوفیاء کرام ہی معرفت الٰہی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کی سیرت سب کی سیرتوں سے بہتر ہے۔ ان کا طریقہ سب کے طریقوں سے درست' ان کا خلق سب کے اخلاق سے پاکیزہ ہے بلکہ اگر تمام عقلاء کی عقل' حکماء کی حکمت' علماء کا علم اور اس کے اسرار کو جمع کرلیا جائے تب بھی ان کے سیرت و اخلاق سے بہتر نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات براہ راست سینہ نبوت کے نور سے فیضیاب و مستنیر ہوتے ہیں اور اس کائنات میں نور نبوت سے بڑھ کر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے۔

(المنقذ من الضلال)

مقدمہ

تمہید

ہماری حیات اجتماعی کے سرچشمے کتاب وسنت اور تاریخ اسلام ہیں۔ اسلام کی تاریخ دو ادوار پر منقسم ہے۔

۱۔ دور بعثت ۲۔ دور مابعد بعثت

دور بعثت اسلامی معاشرے کے قیام و تاسیس اور اس کی بقاو ترقی کی جدوجہد کا دور ہے جس سے اسلامی فضائل حقائق واقعہ کے طور پر مسلم ہوئے اور دور مابعد بعثت ان فضائل کو محفوظ (Preserve) کرنے اور برقرار رکھنے کی جدوجہد کا دور ہے اس لئے یہ کہنا بجا ہے کہ دور بعثت کی تاریخ معیاری دین کی اور دور مابعد بعثت کی تاریخ معمول بہ دین کی تاریخ ہے۔ کتاب سے ہمیں اسلام کی نظریاتی اساس میسر آتی ہے' سنت اس نظریے کے معیاری نمونہ عمل کی حیثیت رکھتی ہے اور دور مابعد بعثت کی تاریخ زندگی کو کتاب وسنت کے مطابق رکھنے کی جدوجہد پر مشتمل ہے۔ مذہبی زندگی میں شریعت اور طریقت دونوں کی حیثیت معمول بہ دین کی ہے۔ شریعت اوامر ونواہی کا وہ نظام ہے جس کی بدولت انفرادی اور اجتماعی زندگی ضبط وانقیاد کی پابند رہتی ہے اور طریقت اوامر ونواہی کے اتباع میں "اخلاص فی العمل" کے ذریعے ایمان کو "درجۂ احسان"[1] پر فائز کرنے کی تدبیر ہے۔

جب سے ہماری زندگی پر استعماریت کی گرفت مضبوط ہوئی ہم کتاب وسنت اور تاریخ اسلام سے اپنی حیات ملی کے لئے ولولہ اخذ کرنے اور اس کے ذریعے

---

[1] الاحسان ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

(احسان یہ ہے کہ تو خدا کی اس طرح عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے کیونکہ اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے) (صحیح بخاری' ۱:۱۲)

موثرات اختلال کا تدارک کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔ ہمارا رشتہ اپنے پر عظمت ماضی سے منقطع ہو گیا اور اپنے حال و مستقبل کو بہتر بنا سکنے کا اعتماد مضمحل ہو گیا۔ اس اعتماد کو از سر نو بحال کرنے کے لئے ان مسائل پر غور و خوض کی ضرورت محسوس ہوئی کہ:

۱۔ مسلم (اسلامی) معاشرے سے کیا مراد ہے؟

۲۔ معاشرے میں اختلال کے اسباب کیا ہیں؟

۳۔ تصوف سے کیا مراد ہے؟

۴۔ اور اس کے ذریعے اسباب اختلال کا تدارک کیونکر ممکن ہے؟

تہذیبی و ثقافتی زندگی کے معرض ارتقاء میں ہونے کے باعث ہر دور میں تصوف کی طرف متوجہ کرنے والے موثرات الگ الگ رہے اور اسی بنا پر صوفیانہ فکر بھی ارتقاء پذیر رہا۔ لیکن تصوف جن مدارج ارتقاء سے بھی گزرا اس کی ارتقائی حرکت کی سمت یہی رہی کہ صوفیانہ مذہبی واردات انجام کار پیغمبرانہ وحی کے مطابق ہو جائیں چنانچہ جہاں کہیں ان کے مابین عدم مطابقت کا شائبہ ہوا اسے رفع کر کے سازگاری و ہم آہنگی پیدا کی گئی۔ اس اعتبار سے تصوف دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ دور ماقبل تنقید ۲۔ دور تنقید

دور ماقبل تنقید

اس دور میں تصوف چار مراحل سے گزرا ہے۔

مرحلۂ اولیٰ: زہد و ورع اور تقویٰ کا دور

مرحلۂ ثانیہ: مجاہدۂ نفس اور باطنی کیفیات کا دور

مرحلۂ ثالثہ: جذب اور نسبت توجہ کا دور

مرحلۂ رابعہ: حقائق کی نظری تشکیل کا دور

مرحلۂ اولیٰ

عہد رسالت اور عہد صحابہ و تابعین میں تصوف اپنے ارتقائی عمل

(Developmental Process) کے اعتبار سے پہلے مرحلے میں تھا۔ اس میں زہد و ورع اور تقویٰ کا رنگ غالب تھا۔ مردان حق اپنی باطنی زندگی کے جملہ مراتب وکمالات اسی طریق سے حاصل کرتے تھے اور خدا تعالیٰ سے قرب وحضوری کی نسبت بھی اسی طرح متحقق ہوتی تھی۔ ان سے بھی مستی و بے خودی اور خوارق وکمالات کا ظہور جس کا تعلق نفسی احوال سے ہوتا تھا مگر بہت کم۔ اس دور میں صحابہ کرام میں سے اصحاب صفہ اور تابعین میں سے امام حسن بصریؒ اور اویس قرنیؒ، امام زین العابدینؒ، سعید بن مسیبؒ طاؤس یمانیؒ۔ داؤد بن دینارؒ۔ سلیمان تمیمیؒ عامر بن عبد اللہ تمیمیؒ اور محمد بن مکندر کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

مرحلۂ ثانیہ

عہد تبع تابعین میں تصوف اپنی دوسری ارتقائی منزل میں داخل ہوا۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں، جب اخلاص فی العمل کا زوال شروع ہوا اور محض فقہیت کی جانب میلان کی بنا پر شریعت کی جگہ تشرع نے لے لی تو اہل حق نے اخلاص فی العمل کی خاطر مجاہدۂ نفس کی طرف رجوع کیا اور ریاضت ومجاہدہ کے ذریعے تعلق باللہ کی نسبت پختہ کی۔ مجاہدۂ نفس کی وجہ سے انہیں انس و وحشت، مستی و بے خودی، کشف واشراف اور خوارق وکرامات کی صورت میں باطنی کیفیات حاصل ہوئیں اور انہوں نے یہ احوال، نکات واشارات میں بیان بھی کیے اس مرحلۂ تصوف میں رابعہ بصریؒ۔ حبیب عجمیؒ۔ مالک بن دینارؒ۔ فضیل بن عیاضؒ۔ عبد اللہ بن مبارکؒ۔ ابراہیم بن ادھمؒ۔ بشر الحافیؒ۔ شیبان راعیؒ۔ ذوالنون مصریؒ۔ حارث المحاسبیؒ۔ بایزید بسطامیؒ۔ سری سقطیؒ۔ جنید بغدادیؒ اور سہل بن عبد اللہ تستری وغیرہم کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

مرحلۂ ثالثہ

یہ عہد چوتھی اور پانچویں صدی ہجری پر مشتمل ہے اس مرحلہ میں اہل کمال میں سے عوام تو حسب سابق شرعی اوامرونواہی پر مکتفی رہے خواص نے باطنی احوال وکیفیات کو اپنا مطمح نظر بنا لیا۔ لیکن خواص الخواص اعمال واحوال سے گزر کر "مقام

جذب" تک پہنچے اسی جذب ہی کی وجہ سے ان پر نسبت توجہ کا راستہ منکشف ہوا۔ تعینات کے پردے چاک ہوئے اور انہوں نے مشاہدۂ حق تک رسائی حاصل کر لی۔ پھر انہیں ذات حق میں محویت واستغراق نصیب ہوا اور توحید وجودی وشہودی میں فرق وامتیاز باقی نہ رہا۔ اس عہد میں شیخ ابو سعید خزار"، ابوالحسن خرقانی" ۔ ابو علی رودباری" ۔ ابوالفرح طرطوسی" ۔ ابوبکر شبلی" ۔ ابوالقاسم القشیری اور ابو عثمان المغربی" کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ امام غزالی اور حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی" بھی اسی دور کے اواخر میں ہوئے۔ آپ کی حیثیت کاروان صوفیا کے راہبرو رہنما کی تھی۔

مرحلۂ رابعہ

یہ عہد چھٹی اور ساتویں صدی ہجری پر مشتمل ہے۔ اب صوفیاء کرام نے باطنی واردات کے ذریعے حاصل شدہ تصور حقیقت کی نظری تشکیل کی اور حقائق تصوف پر بحث وتدقیق کا آغاز ہوا۔ انہوں نے ظہور وجود کے مدارج وتنزلات[1] پر گفتگو کی۔ اس طرح تصوف مابعد الطبیعیاتی مسائل اور فلسفیانہ مباحث سے دوچار ہوا۔ نظریہ وحدت الوجود اس دور میں دلائل نظری کی بنیاد پر مرتب صورت میں سامنے آیا۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ ابن الفارض الحموی نے اپنی تصنیفات میں علم وحکمت کی ادق زبان میں اس تصور کو دلائل وبراہین کے ساتھ بیان کیا اور شیخ عطار" ، عارف رومی" اور مولانا جامی" نے شعر کے دلکش وجد آور اور زود اثر پیرائے میں ان حقائق کو ادا فرمایا۔ اس طرح معارف تصوف خواص سے عوام تک پہنچے اور ہر مخلص تصوف کا کلمہ پڑھنے لگا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی" ان مراحل اربعہ پر شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

بالجملہ ایں چہار راہ قدم الصدق است	الغرض یہ چاروں راستے ملاء اعلیٰ میں
در ملاء اعلیٰ، و واجب آں است کہ کلام	قدرومنزلت اور حق وصداقت کے حامل

---

[1] تنزلات خمسہ (ذات احد، تنزلات وحدانیت، تنزل ارواح، عالم امثال، عالم اجسام)

ہر طبقہ را برمناسب اذواق وے حمل کنند ویکے را برمذاق دیگر نیارند

(لمعات'۲:۲۰)

ہیں اور ضروری ہے کہ ارباب تصوف پر بحث کرتے ہوئے ان کے اقوال واحوال کو ان کے ہی عہد کے ذوق کی مناسبت سے جانچا جائے ایک عہد کے صوفیاء کے احوال دوسرے دور کے معیاروں پر محمول نہ کئے جائیں۔

دور تنقید

جب حقائق تصوف کی نظری تشکیلات کا اثر معاشرے میں سرایت کر گیا اور جاہل عوام نے اپنے ناقص فہم کی بنا پر صوفیانہ کشف کو حتمی قطعی اور یقینی ذریعہ علم حقیقت سمجھ لیا تو اس طرح ان کے نزدیک احتیاج وحی ساقط ہو گئی۔ انہوں نے بربنائے جہالت شریعت و طریقت کو متضاد و متنافی تصور کر لیا۔ اس طرح آزاد خیالی اور آزاد روی کا میلان پیدا ہونے لگا تو تاریخ تصوف میں دور تنقید کا آغاز ہوا۔ دور تنقید میں تصوف کی خدمت اور اس کی حدود صحت کے تعین کے بعد برصغیر پاک و ہند میں ترویج واشاعت کا سہرا مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ وغیرہم کے سر ہے۔

ان بزرگوں نے جاہل عوام کے ذہنوں سے شبہات فاسدہ کا ازالہ کر کے شریعت و طریقت کو پھر سے یکجا کر دیا۔ چنانچہ اس امر کی طرف اشارہ شیخ مجدد اپنے بیٹے خواجہ محمد معصومؒ کے نام خط میں بھی کرتے ہیں۔

الحمد للہ الذی جعلنی صلۃ بین البحرین ومصلحا بین الفئتین

(مکتوبات امام ربانی'۲: مکتوب نمبر۶)

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے دو سمندروں کو ملانے اور دو جماعتوں میں صلح کا ذریعہ بنایا ہے۔

آپ نے عوام کے قلوب واذہان میں تمسک بالکتاب والسنہ کی اہمیت اجاگر

کی اور بحیثیت ذریعہ علم کشف و وجدان کی حقیقت و قطعیت کا انکار کیا تاکہ اسے وحی کا بدل تصور نہ کیا جا سکے۔ اس دور میں اس حقیقت کو دلوں میں جاگزیں کرایا گیا کہ صوفیانہ مذہبی واردات حق ہیں ان کا انکار ناممکن و محال ہے لیکن ان کی حیثیت باطنی کیفیات اور روحانی ادراکات کی ہے۔ ادراک حقیقت میں اصحاب ولایت کے کشف، جو فرق مدارج کے باعث مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا انحصار تزکیہ باطن پر ہے لہٰذا کشف و وجدان کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کی صحت و عدم صحت کا معیار شریعت ہے لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ حقیقت کشف اور حیثیت وجدان کو سمجھے بغیر شریعت سے محض ظاہری تعارض کی بناء پر نفس کشف کا انکار کر دے۔

ذرائع علم حقیقت

حواس خمسہ، عقل، کشف و وجدان اور وحی:

حواس کا ادراک صرف محسوسات تک محدود ہے مدرکات حسی سے ماوراء حقائق کے لئے حواس ذریعہ علم نہیں ہیں۔ اسی طرح عقل کی کار فرمائی بھی محدود ہے اس کا ادراک محض معقولات تک ہے۔ عقل کا ادراک بھی حواس کے ذریعے خام مواد علم حاصل کئے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ مزید برآں حواس اور عقل دونوں مل کر بھی حتمی و قطعی علم مہیا نہیں کر سکتے۔ اگر ان کے حرمان قطعیت اور نقصان ادراک و معرفت کے باوجود انہیں ذریعہ علم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے تو پھر کشف و وجدان کے ذریعہ علم حقیقت ہونے میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے۔ تمام تر حقائق و موجودات جو عالم طبعیات میں ہیں خواہ ان کا شمار محسوسات میں ہو یا معقولات میں زمانی ہوں یا مکانی صوفیانہ کشف کے ذریعے ان کا ادراک نہ صرف عقلاً و نقلاً ممکن ہے بلکہ واقع ہے۔ کشف کے ذریعے صوفیاء کو عالم مابعد الطبیعات کا ادراک و معرفت بھی ہوتی ہے لیکن یہ علم وحی کی مانند حتمی قطعی اور یقینی نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی نفسی استعداد ہے جس کی صحیح نشوونما اور فروغ تصوف ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ جب صوفی تزکیہ و تصفیہ

میں منتہائے کمال پر پہنچتا ہے اور وہ مدارج ولایت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے تو اس کا کشف مشمولات وحی کے مطابق و موافق ہو جاتا ہے اور یہی مطابقت و موافقت اس کی صحت کی دلیل ہے۔

سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔

ان طلبت اللہ بالصدق اعطاک مراۃ تبصر فیھا کل شئی من عجائب الدنیا والاخرۃ

(غنیۃ الطالبین: ۹۲۷)

اگر تو خدا کو صدق دل سے طلب کرے تو وہ تجھے آئینہ قلب عطا کرے گا جس میں تو دنیا و آخرت کے تمام عجائبات کا مشاہدہ کرے گا۔

امام غزالی اس مسئلہ کی نسبت یوں رقم طراز ہیں۔

و وراء العقل طور اخر تنفتح فیہ عین اخری یبصر بھا الغیب وما سیکون فی المستقبل وامورا اخر العقل معزول عنھا

(المنقذ من الضلال ۵۴)

اور ورائے عقل ایک اور رستہ ہے جس میں دوسری (باطنی) آنکھ کھل جاتی ہے اس کے ذریعہ غیب کا ادراک ہوتا ہے۔ مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور دیگر ایسے امور جن سے عقل قاصر ہو، بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ تصوف کو واردات مذہبی (Relijious Experience) کے نام سے موسوم کرتے ہوئے عقلی براہین کی اساس پر اس کی تائید و حمایت کرتے ہیں اور اس کے ذریعے علم و معرفت ہونے کو ناقابل انکار حقیقت تصور کرتے ہیں۔ [1]

---

[1] ملاحظہ ہو۔

"The Reconstruction of Religious Thought in Islam"

Ch.Ist Knowledge and Religious Experience

الغرض تصوف کو اپنے مقاصد و نتائج کے باعث اسلامی معاشرے کے ہر دور میں ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ اسلامی معاشرے میں تصوف کی اسی اہمیت وافادیت کے پیش نظر مستشرقین نے اسے مرکز اتہام بنایا۔ انہوں نے اسلامی تہذیب کو قدیم ہندو مصر اور بابل و نینوا کی مانند ختم شدہ قوت ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی اور اس ضمن، عالم اسلام کے سامنے ان نام نہاد محققین نے یہ باطل مفروضہ پیش کیا کہ

- اسلام کا ادب و معاشرہ دور جاہلیت کے عربوں کی نسلی میراث ہے۔
- اسلام کا فقہی قانون رومن لاء (یہودیت) سے ماخوذ ہے۔
- اسلام کا فلسفیانہ فکر یونانی فلاسفہ سے مستعار ہے۔

اور

- اسلام کا اخلاق مذہب و تصوف عیسائیت سے مستعار ہے۔

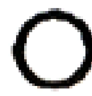
الغرض مستشرقین نے اپنے سیاسی اور مذہبی عناد و تعصب کی بنا پر اسلامی تہذیب کے ہر کمال کا انکار کر دیا اور مسلمانوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اسلام کی عمارت کا سارا ملبہ اغیار (غیر مسلموں) سے حاصل کردہ ہے مستزاد یہ کہ کمالات اسلام کے انکار پر مبنی اس مخصوص نقطۂ نظر کو اسلامی تحقیق (Islamic Research) کا نام دیا گیا ہے۔

تصوف کو سب سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا ہندو زعما نے اس کی اصل کی نسبت اپنی جانب کی انہوں نے تصوف اسلامی کا ماخذ و منبع ہندومت کو قرار دیا۔ غیر مسلم مفکرین اپنے مذموم مقاصد میں کسی حد تک کامیاب ہوئے اور شومئی قسمت کہ بعض مسلم زعماء کے اذہان بھی اس متعصبانہ پروپیگنڈا (Prejudistic And Provocative Propaganda) سے مسموم ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے بھی اس انداز سے سوچنا شروع کر دیا کہ تصوف واقعی عیسائیت اور ہندومت سے مستعار ہے۔ حالانکہ تصوف کی نسبت یہ نقطۂ نظر محض سطحی مطالعہ سے پیدا ہوا تھا۔

اگر اسلام میں تصوف کے آغاز و ارتقاء کی تاریخ اسلامی معاشرے میں اس کی ضرورت و احتیاج اور اس کے مقاصد و نتائج پر ان کی گہری نظر ہوتی تو ان کے ذہن میں تمرد و انحراف اور فکر میں شبہ و التباس پیدا نہ ہوتا۔ اس لئے اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ افراط و تفریط سے مجتنب رہ کر تصوف کے بارے میں صحیح اسلامی نظریہ پیش کیا جائے تاکہ یہ حقیقت منصۂ شہود پر آ سکے کہ

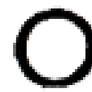
"اسلامی معاشرے میں تصوف کو بہت اہم مقام حاصل ہے"

فصل دوم



۱۔ اسلامی معاشرے کی خصوصیات

۲۔ اسلامی معاشرے میں تصوف کی احتیاج



۱۔ تصوف بحیثیت تزکیۂ نفس

۲۔ تصوف بحیثیت مذہبی واردات

اسلامی معاشرے کی خصوصیات

تقاضائے موضوع یہ ہے کہ اسلام اور معاشرے کا باہمی ربط و تعلق واضح کیا جائے۔ اس لئے سب سے پہلے مفہوم اسلام کی وضاحت درکار ہو گی۔ لہٰذا اولین سوال یہ ہوا کہ اسلام کیا ہے؟

محض لغوی اشتقاق سے اسلام کے صحیح و جامع مفہوم تک رسائی ناممکن ہے چنانچہ ہم لغوی معنی کے تجسس کی بجائے یوں غور کرتے ہیں کہ:

۱۔ اسلام کا مبدأ کیا ہے؟

۲۔ اسلام کی ماہیت کیا ہے؟

۳۔ اور اسلام کی غایت کیا ہے؟

○ اسلام کا مبدأ وحی ہے اس لحاظ سے یہ "منزل من اللہ" ہے۔

○ اس کی ماہیت بندے اور خدا کے درمیان نسبت عبودیت کا تحقق ہے۔ جس کی اساس پر زندگی کو ڈھالنے کے لئے ایک ضابطۂ حیات پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔

○ اسلام کی غایت و مقصد ایک ایسا صالح معاشرہ پیدا کر کے اسے عالمی سطح پر غالب کرنا ہے۔ جو

۱۔ وحدت نوع انسانی کے تصور پر مبنی ہو۔

۲۔ اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔

۳۔ ان کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ ہو جائے۔

۴۔ اور اس معاشرے کی بنائے استحکام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس قدر خالص وفاداری ہو کہ "شرک فی النبوۃ" کا شائبہ نہ رہے۔

غایت اسلام (مثالی معاشرہ قائم کر کے اسے عالمی سطح پر غالب کرنا) اس آیت

کریمہ سے نمایاں ہوئی ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

(التوبہ ۹: ۳۳)

وہ (اللہ) جس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس دین کو باقی تمام ادیان پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرکین اسے ناپسند جانیں۔

○ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام وحدت نوع انسانی کے تصور پر مبنی معاشرہ کیوں چاہتا ہے؟

اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ دنیا میں معاشرے تین قسم کی وفاداریوں پر قائم ہوتے ہیں۔

۱۔ جغرافیائی وفاداری

۲۔ نسلی و لسانی وفاداری

۳۔ معاشی وفاداری

یہ تینوں محدود وفاداریاں ہیں اور محدود وفاداریوں پر قائم ہونے والے معاشرے کا طرز عمل دوسروں کی نسبت بغض و عناد اور حسد و کینہ کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں ہمہ گیریت مفقود ہوتی ہے۔

چنانچہ اسلام نے معاشرے کو بغض و عناد اور محدود وفاداری کی اذیت سے بچانے کے لئے وحدت نوع انسانی کا تصور پیش کیا۔ تاکہ معاشرے کی وفاداری لامحدود اور عالم گیر ہو۔ قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیات اسی تصور کو نمایاں کرتی ہیں۔

۱۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

(النساء ۴: ۱)

اے لوگو! اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔

۲۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً

(البقرہ ۲: ۲۱۳)

لوگ (ابتداءً) ایک ہی جماعت تھے۔

○ معاشرہ اسلامی کی دوسری بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ "اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔ اس آیت کریمہ سے مستنبط ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران '۳:۱۱۰)	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے برپا کی گئی ہے تم بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو۔

اخلاقی جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ زندگی میں محرکِ عمل فرائض کی ادائیگی ہو۔ دیگر معاشرے مطالبہ حقوق کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ جس کے باعث انفرادی واجتماعی حقوق کا باہمی تصادم ہوتا ہے۔ "سرمایہ دارانہ معیشت" پر مبنی معاشرہ فرد کی مکمل آزادی چاہتا ہے۔ یہاں انفرادی حق کی حمایت میں اجتماعی مفاد نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اور "اشتراکی معیشت" پر مبنی معاشرہ اجتماعی حقوق کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس سے انفرادی حقوق بے انصافی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ غیر اسلامی معاشرے انفرادی واجتماعی حقوق کے مابین تصادم وتناقض میں مبتلا رہتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلامی معاشرہ "مطالبۂ حقوق" کی بجائے "ایتائے حقوق" (ادائیگی فرائض) کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور انفرادی واجتماعی طور پر افراد کی زندگی میں فرض کی بجاآوری، عمل کی محرک ہوتی ہے۔ جب ہر فرد اپنا فرض ادا کرنے پر مصر ہو تو کسی کی حق تلفی ممکن نہیں۔ فرض کسی واجب التعمیل قانون کے شعور کا نام ہے اور اخلاقی زندگی اس پر منحصر ہے کہ اعمال کا صدور حکم کی بجاآوری کی نیت سے ہو۔ جو اعمال اخلاقی حکم کی اتباع میں صادر ہوتے ہیں وہ نیک اعمال ہیں اور جو حکم کی خلاف ورزی کی نیت سے سرزد ہوں وہ برے اعمال ہیں۔ پس "اخلاقی جدوجہد" فرائض کے شعور سے ہی ممکن ہے مگر فرائض کو بجالانے کے لئے ولولہ اور جذبہ صرف "ایمان باللہ" سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا آیت کے آخر میں "تومنون باللہ" کی شرط عائد کی گئی ہے۔ ایمان باللہ میں تحقق کو ہی روحانی الذہن ہونے سے تعبیر کیا جاتا

ہے۔ روحانی الذہن ہونے کی شرط یہ ہے کہ خدا اور آخرت پر کامل یقین ہو۔ اور انسان کی فطرت میں خدا طلبی کا جو داعیہ ودیعت کیا گیا ہے۔ اسے بیدار کیا جائے۔ خدا طلبی کا داعیہ صرف دو حالتوں میں شدت سے بیدار ہوتا ہے۔

ا۔ کوئی ایسا مقصود (آرزو) انسان کے دل کو گرمائے جس کی تحصیل کے لئے اس کے ذاتی اسباب ووسائل کفایت نہ کرتے ہوں اور اس مقصود کی طلب بھی اتنی شدید ہو کہ اس سے دستبردار نہ ہوا جا سکے۔ تو ایسی حالت میں انسان کے اعماق قلب سے پکار اٹھتی ہے اور خدا طلبی کا داعیہ خوب بیدار ہو جاتا ہے۔

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا مجھ کو
وگرنہ ہم خدا ہوتے جو دل بے مدعا ہوتا

۲۔ کوئی بڑا خطرہ وبال بے درماں بن گیا ہو جس سے انسان اپنے ذاتی وسائل کی بنا پر خود کو محفوظ نہ کر سکے تو اس مرحلے پر بھی خدا طلبی کا داعیہ بیدار ہوتا ہے اور انسانی فطرت کی گہرائیوں سے مدد کے لئے دعا اٹھتی ہے۔ چنانچہ روحانی الذہن ہونا خدا و آخرت پر کامل یقین کئے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے اسلامی معاشرے کے افراد کو "رسوخ فی الایمان" حاصل ہونا ضروری ہے۔

○ اسلامی معاشرے کی تیسری خصوصیت کہ "افراد کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ دونوں ہر قسم کے خوف وغم سے محفوظ ہو جائیں" یہی الہامی ہدایت کا مقصود و مطلوب ہے۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ
(البقرہ ۲:۳۸)

پس اگر میری جانب سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئی تو بس نے میری بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی کی اس کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یہ امر ابدی ہے کہ جب تک انسانی شخصیت خوف وغم سے آزادانہ ہو اس کی مناسب نشوونما نہیں ہو سکتی اور جو معاشرہ افراد کو خوف وغم سے محفوظ نہیں کر سکتا

اور سلامتی بہم نہیں پہنچا سکتا وہ اسلامی معاشرے کا مصداق نہیں ہو سکتا۔
قرآن حکیم نے اسلامی معاشرے کے افراد کو ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہو جانے کا حکم دیا ہے۔

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِ (المائدہ ۵:۳)

آج کے دن کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں۔ پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔

ایک اور مقام پر ارشاد الٰہی ہے۔

وَ لَا تَھِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (آل عمران ۳:۱۳۹)

اور نہ تم پست ہمت بنو اور نہ تم خوف کھاؤ تم ہی غالب ہو گے اگر صاحب ایمان ہو۔

○ اسلامی معاشرے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنائے استحکام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے اس قدر خالص وفاداری ہے کہ "شرک فی النبوۃ" کا شائبہ نہ رہے۔ اور یہی کلمہ طیبہ کا مقصد ہے۔ لا الہ الا اللہ پر یقین رکھنے سے انسان "شرک فی التوحید" سے محفوظ ہوتا ہے۔ اور اس کی انفرادی سیرت روحانی الذہن ہونے کے نمونے پر ڈھلتی ہے۔ اور محمد رسول اللہ پر یقین رکھنے سے "شرک فی النبوۃ" کا شائبہ دور ہو جاتا ہے۔ اور معاشرہ وفاداری کی تقسیم سے محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ معاشرے میں اختلال وافتراق کے اسباب کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کی ذات اقدس سے خالص وفاداری کے بغیر تصور ایمان مضمحل ہو جاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (النساء ۴:۶۵)

پس بخدا وہ صاحب ایمان نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ وہ آپ کو اپنے مابین پیدا ہونے والے نزاعات میں حکم نہیں بنا لیتے، پھر آپ (ﷺ) کے فیصلے پر ان کے دلوں میں کوئی تنگی باقی نہیں رہتی اور وہ اس

کو پوری طرح تسلیم نہیں کر لیتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی مفہوم کو واضح کرتی ہے۔

لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین

(صحیح البخاری، ۱:۷۷)

تم میں سے کوئی شخص بھی مومن نہیں ہو سکتا تاآنکہ میں اسے اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہیں ہو جاتا۔

ایسے مثالی معاشرے کے قیام کے بغیر اسلام کی ہیئت عملی ہی متصور نہیں ہو سکتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان جس کی تخریج امام مسلم ؒ نے اپنی "صحیح" میں کی ہے اس امر کو مزید مؤکد کر دیتا ہے۔

لا اسلام الا بالجماعۃ، لا جماعۃ الا بالامیر لا امیر الا بالسمع و الطاعۃ

(جامع العلم لابن عبد البر، ۱:۶۲)

اسلام جماعت کے بغیر اور جماعت امیر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور امیر کی جب تک اطاعت نہ ہو، امارت صحیح نہیں ہوتی۔

اب سوال یہ ہے کہ

i۔ ایسا مثالی معاشرہ کیونکر وجود میں آسکتا ہے؟

ii۔ کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

iii۔ اور کیسے ترقی کر سکتا ہے۔

معاشرہ اسلامی کے وجود، بقا و استحکام اور ترقی کے لئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔

۱۔ انسانی شخصیت کی نشوونما

DEVELOPMENT OF HUMAN PERSONALITY

۲۔ ہیئت عمرانی کی تکمیل

COMPLETION OF SOCIAL MACHINERY

۳۔ ماحول کی تسخیر CONQUEST OF ENVIRONNMENT

○ انسانی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک کی نشوونما درکار ہے۔

ا۔ حیاتی پہلو:۔

اس کی نشوونما کے لئے خوراک لباس اور رہائش کی سہولتیں درکار ہیں۔

۲۔ عمرانی پہلو:۔

انسانی شخصیت کے اس پہلو کے دو رخ ہیں۔

(i) عمرانی حیاتی پہلو:۔

یہ بقائے نسل کا متقاضی ہے۔

(ii) عمرانی ثقافتی پہلو:۔

یہ تعلیم اور کسب معاش کی تربیت سے نشوونما پاتا ہے۔

۳۔ نفسیاتی پہلو:۔

اس کا تقاضا یہ ہے کہ جذبہ' ارادہ اورادراک تینوں کی متناسب (Proportional) نشوونما ہو۔

۴۔ انفسی پہلو:۔

اس کی نشوونما کا تقاضا یہ ہے کہ شعور ولاشعور دونوں ہم آہنگ وسازگار ہو جائیں اگر ان کے تقاضے متناقض ومتضاد ہوں تو ذہنی صحت برقرار نہیں رہتی۔

۵۔ ماورائی پہلو:۔

یہ پہلو علم اخلاق' آرٹ اور مذھب کی نشوونما سے متعلق ہے۔

اور ہیئت عمرانی کی تکمیل معاشرہ اسلامی کی دوسری اہم شرط ہے۔ زندگی میں

معیاری نمونہ ہائے عمل تک پہنچنے اور فضائل سیرت کو واقعہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اوامرونواہی کے اتباع کی شکل میں اجتماعی زندگی کو مرتب و منظم کیا جائے اور یہ ضبط وانقیاد صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر افراد کے اجتماع سے ایسے ادارے قائم ہوں جن کا عمل اوامرونواہی کے تابع منظم طور پر حصول مقاصد کا ذریعہ بنے۔ اسی کوشش کا نام ہیئت عمرانی کی تکمیل ہے۔ اس میں خاندان' مدرسہ' بیت المال' ریاست الغرض تہذیب و معیشت کے دیگر ادارے بھی شامل ہیں یہ اداراتی شکل ہی معاشرہ کہلانے کی مستحق ہے اور اس صورت میں افراد کی صحیح نشوونما ہو سکتی ہے۔

○ معاشرے کی بقاو ترقی کا انحصار ثالثاً تسخیر ماحول پر ہے۔ ماحول کی دو اقسام ہیں۔

۱۔ فطری ماحول

۲۔ انسانی ماحول

فطری ماحول میں مظاہر فطرت شامل ہیں جن کی تسخیر سائنس (SCIENCE) اور ٹیکنالوجی (TECHNOLOGY) کی ترقی سے ممکن ہے۔ تسخیر ماحول کا تصور قرآن کی اس آیت سے مستفاد ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے لئے اس نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ مطیع کر دیا ہے۔
(لقمان' ۳۱:۲۰)	

انسانی ماحول بھی دو انواع پر منقسم ہے۔ ایک جو اسلامی معاشرے سے بے تعلق ہو اور ضرر رساں نہ ہو۔ ایسے ماحول کو محض اسلامی معاشرے کی نفع بخشی و فیض رسانی مسخر کرے گی اور دوسرا ضرر رساں جو اسلامی معاشرے کے خلاف دشمنی وعداوت پر قائم ہو۔ اسے بذریعہ قوت دبا کر ہی مغلوب و مسخر کیا جا سکتا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے جہاد کی بار بار تاکید وارد ہوئی ہے۔

وَ قَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَاتَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ	اور ان سے لڑو تا آنکہ مکمل طور پر فتنہ نہ رہے اور ہر طرح سے دین اللہ ہی کا ہو جائے۔
(الانفال' ۸:۳۹)	

یہ وہ شرائط ہیں جو ایک صحت مند اسلامی معاشرے کی جزو لاینفک ہیں۔ ان کے فقدان سے اسلام کی غایت لِیُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ حاصل نہیں ہو سکتی۔

اسلامی معاشرے میں تصوف کی احتیاج

اب ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ اسلامی معاشرے اور تصوف میں کیا ربط و تعلق ہے۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے وجود میں آنے' باقی رہنے اور ترقی پانے میں تصوف کی کیا ضرورت و احتیاج ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلے تصوف کے اصل مفہوم و مراد کو متعین کرنا ضروری ہے۔ تصوف کے لغوی اشتقاق کی بحث آگے آئے گی۔ مگر چونکہ محض لغوی معنی سے مفہوم اصلی تک رسائی نہیں ہوتی اس لئے سردست ہم لغوی بحث سے صرف نظر کرتے ہیں۔ تصوف کے بارے میں بعض اذہان' اشکال اور شبہ والتباس کا شکار ہو۔ ہیں۔

تصوف کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تصوف تزکیۂ نفس سے عبارت ہے اور دوسرے یہ کہ تصوف ان مذہبی واردات کا نام ہے جن کے ذریعے ایمانی حقائق کے نتائج کا مشاہدہ ہوتا ہے اور ایمان کے بعد درجہ "ایقان" حاصل ہوتا ہے۔ اب ہم تصوف کی ان دونوں حیثیتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

تصوف بحیثیت تزکیہ نفس

اسلامی معاشرے کا ہر فرد انفرادی طور پر تصوف کا محتاج ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ اسلامی معاشرے کا وجود و بقا ایسے افراد پر منحصر ہے جو اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن ہوں ایسے مطلوبہ افراد صرف اسی صورت میں میسر آسکتے ہیں۔ اگر انسانی شعور' انحراف کے تمام میلانات سے پاک و منزہ ہو۔ جب تک نفس انسانی کا تزکیہ نہ ہو انحراف شعور اور اختلال سیرت کے رفع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ غیر مزکی نفس انسان کو ہمیشہ بد اعمالیوں پر اکساتا ہے۔ ہدایت ربانی خود اس امر کا فیصلہ کرتی ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ — بے شک نفس برائی کا حکم دینے والا ہے۔
(یوسف ۱۲:۵۳)

اب سوال یہ ہے کہ نفس کے میلان انحراف اور رجحان تمرد سے نجات وفلاح کیونکر حاصل ہو۔ قرآن حکیم اس بارے فصاحت وصراحت سے حکم دیتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا — گویا جس کسی نے بھی نفس کا تزکیہ کر لیا وہ فلاح پا گیا۔
(الشمس ۹۱:۹)

چنانچہ انسان کو اعمال وکردار کے اعتبار سے مزکی ومنقاد ہونے کے لئے اپنے نفس کا تزکیہ درکار ہے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔

انسانی شخصیت کی نشوونما کے اہم ترین پہلو اس کے انفسی، نفسیاتی اور ماورائی پہلو ہیں۔ انفسی پہلو کی نشوونما جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے شعور اور لاشعور کے ہم آہنگ وسازگار ہونے کی متقاضی ہے۔ یہاں قابل فہم امر یہ ہے کہ لاشعور میں نیکی وبھلائی غالب رہتی ہے اور شعور کی سطح پر انحراف ہوتا ہے۔ یہ تضاد ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ تاوقتیکہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو اپنے تابع نہ کر لے دراصل انسانی شعور، نفس کی خواہشات ذمیمہ سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اس طرح شعور ولاشعور کے تقاضے باہم متناقض ومتضاد رہتے ہیں۔ اب انہیں ہم آہنگ وسازگار بنانے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ لاشعور کو شعور کے تابع کر دیا جائے۔ یعنی تقاضائے نیکی کو تقاضائے بدی کے تابع کیا جائے اس صورت میں ہم آہنگی اور مطابقت وموافقت تو حاصل ہو جائے گی۔ مگر انفسی پہلو کی نشوونما غلط راستے پر ہو گی جس سے روحانی الذہن اور اخلاقی جدوجہد کرنے والے افراد پیدا نہ ہوں گے اور اسلامی معاشرے کا وجود ناپید رہے گا۔ دوسرے یہ کہ شعور کو لاشعور سے مغلوب کر دیا جائے یعنی تقاضائے بدی تقاضائے نیکی کے تابع ہو جائے۔ مگر یہ صورت تب ہی ممکن ہے۔ اگر نفس انسانی مزکی ومصفی ہو۔ اگر نفس امارہ بدستور برائیوں اور بداعمالیوں پر اکسانے میں محو ہو تو شعور اپنا خرد وانحراف ختم کر کے لاشعور کے تابع کیونکر ہو گا۔ اس لئے انسانی شخصیت کے

انفسی پہلو کی صحیح نشوونما کے لئے شعور کو لاشعور سے سازگار بنانا ہو گا۔ اس کے لئے شرط اولین "تزکیۂ نفس" ہے اور یہی فی الحقیقت تصوف کی ماہیت و مقصد ہے مزید برآں نفسیاتی پہلو کی نشوونما بھی جو ارادہ، جذبہ اور ادراک کی متناسب ترقی سے ہوتی ہے اس امر کی متقاضی ہے کہ نفس انسانی مزکی و منقاد ہو۔

انسانی شخصیت کے ماورائی پہلو کی نشوونما کا انحصار اخلاق و مذہب پر زیادہ ہے۔ اخلاق و مذہب کی ترقی جو روحانی تعمیر سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ اسی صورت میں ممکن ہے کہ نفس انسانی کی زیادہ تر قوت و استعداد صرف نیکی کی نشوونما میں صرف ہو۔ کثافت نفس کی وجہ سے نیکی نشوونما نہیں پا سکتی اور نفس کی زیادہ تر قوت داعیات فاحشہ کی تکمیل میں صرف ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ کوئی شخص ایک کیاری بنا کر اس میں پودینہ اگانا چاہے تو پودینہ کی صحیح نشوونما میں وہ گھاس حائل ہو جاتی ہے۔ جو ازخود اس کیاری میں اگ آتی ہے۔ اس کو اکھاڑ پھینکنے سے پودینے کی نشوونما پر اچھا اثر پڑتا ہے کیونکہ جو کھاد پودینے کی نشوونما کے لئے ضروری ہے وہ غیر ضروری گھاس کی نشوونما پر صرف ہونے میں ضائع ہو جاتی تھی۔ مگر اب ساری غذائی قوت محض پودینے کی ہی نشوونما پر خرچ ہونے لگتی ہے۔ یہ عمل (گھاس اکھاڑ پھینکنا) دراصل اس کیاری کا تزکیہ ہے۔

اس طرح نفس کا تزکیہ کرنے سے زیادہ تر تعمیری قوت و استعداد نیکی اور روحانیت کی نشوونما پر صرف ہوتی ہے۔ اور انسانی سیرت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ **نفس امارہ**، **نفس لوامہ** اور پھر **نفس مطمئنہ** اور بالآخر **نفس راضیہ و مرضیہ** سے بدل جاتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان تزکیۂ نفس کی اہمیت و افادیت پر برہان قاطع ہے۔ جب ایک فرد ذاتی طور پر تزکیہ کا محتاج ہے۔ تو پھر معاشرے کو احتیاج تزکیہ سے کیونکر بے نیاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب کہ معاشرہ نام ہی صرف منظم افراد کے ایسے اجتماع کا ہے جو اداراتی صورت میں موجود ہو۔

اس لئے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں۔ کہ معاشرہ اسلامی اجتماعی طور پر اپنے افراد سے تزکیۂ نفس کا مطالبہ کرتا ہے۔ تاکہ وہ اخلاقی جدوجہد کرنے اور روحانی الذہن ہونے پر قادر ہوں۔ اگر افراد ایسے خصائل حمیدہ سے متصف نہ ہوں تو اس معاشرہ کو اسلامی معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔

کیونکہ تصوف اسی تزکیہ کا دوسرا نام ہے' اس لئے یہ دعوی مبنی بر حق ہے کہ اسلامی معاشرہ اپنے وجود' بقا اور ترقی کے لئے تصوف کا محتاج ہے۔

۲۔ تصوف بحیثیت مذہبی واردات

تصوف کی دوسری حیثیت ان مذھبی واردات کی ہے جن کے ذریعے ایمانی حقائق کے نتائج کا مشاہدہ ہوتا ہے اور ایمان کے بعد **"درجہ ایقان"** حاصل ہوتا ہے۔ بقول استاذی المکرم برہان احمد فاروقی "انسانی شخصیت کے منظم و منضبط ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اعتقاد' علم اور عمل باہم سازگار ہوں" زندگی میں اعتقاد اور علم باہم سازگار نہ رہیں تو عمل' اعتقاد کا ساتھ نہیں دیتا' شخصیت اختلال کا شکار ہو جاتی ہے۔

اور سیرت ضبط و انقیاد کی بجائے مضمحل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے انسانی سیرت کو منظم و منضبط کرنے کی خاطر اعتقاد' علم اور عمل کو باہم سازگار کرنا ناگزیر ہے۔ اس کی تائید ہمارے روزمرہ کے مشاہدے سے ملتی ہے۔ ہم بحیثیت مسلم حقائق مابعد الطبیعی پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارا ایوان اعتقاد متزلزل ہے اور ہم بحر تذبذب میں غوطہ زن ہیں۔ اگر قارئین حقیقت پسندانہ نظر سے اپنے دل و دماغ کا جائزہ لیں تو انہیں دبی آواز میں اس امر کی تائید سنائی دے گی۔ بالخصوص ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس کش مکش قلب و ذہن میں مبتلا ہے۔ یہی عدم اطمینان' فکری انتشار اور ذہنی تشتت کا باعث بن رہا ہے۔ ہمیں ایسے حالات میں غور کرنا ہی ہوگا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس اختلال کا سبب کیا ہے؟ ہمارے اعتقاد' علم اور عمل میں یکسانیت اور سازگاری کیوں مفقود ہے؟ کیا اس کا جواب یہی ہے کہ ایسے طبقہ کو محض کافر و ملحد قرار دے دیا جائے۔؟ کیا اس کا علاج یہی ہے کہ اس ہمہ گیر کش مکش سے صرف نظر کر لیا جائے۔ ہرگز نہیں۔

اس طرح مذہبی قیادت اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ہمیں منصفانہ غور و فکر کا انداز اپنانا ہو گا۔ نئی نسل کو ان کی ذہنی و قلبی بے اطمینانی اور فکری افتراق کے باعث لادین قرار دینے کی بجائے انہیں اطمینان بخش جواب مہیا کرنا ہو گا۔ اس کے بغیر عصر حاضر میں اسلام کی صحیح خدمت ناممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور سائنسی دور ہے عقل ہر چیز کو مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ اس کے بعد ردو قبول کا فیصلہ کرتی ہے۔ مخالفین اسلام اپنے نظریات کو تجربہ و مشاہدہ کے ذریعے منوانے میں مصروف ہیں۔ سائنسدان جو دعوٰی کرتے ہیں۔ اسے تجربہ گاہ میں تجربی توثیق کے ذریعے درست ثابت کر رہے ہیں۔ اور عقل لامحالہ انہیں محققین کے دعووں کی جانب جھکی جا رہی ہے، جن کا نظام فکر روحانیت کے انکار اور مادیت کے اثبات پر مبنی اور قائم ہے۔ جو لوگ مادہ کو آغاز و انجام سمجھتے ہیں۔ اور عالم روحانیت یا مسائل مابعد الطبیعیات کی نسبت کوئی واضح ثبوت نہیں رکھتے۔ عقل پسند طبقہ میں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب عقل اپنی عادت کی بنا پر ایمانی حقائق کے نتائج کو مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ تو ناکام رہ جاتی ہے۔ لہٰذا ہمارا علم (جو تجربہ کی بنا پر حاصل ہوتا ہے) اعتقاد (ایمان) کی کامل تائید و تصدیق نہیں کر سکتا۔ جب اعتقاد اور علم میں یکسانیت و ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی تو عمل، اعتقاد سے سازگار نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان کی سیرت و شخصیت مختل ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن موجودہ مذہبی قیادت قرآن و سنت سے ہدایت لے کر اس تشکیک قلب و نظر کو رفع کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتی؟ اب ہمیں قرآن سے یہ تلاش کرنا ہو گا کہ ایمان میں پختگی ثابت قدمی اور رسوخ و تیقن کیسے حاصل ہو؟ تجربہ و مشاہدہ کی جستجو اور طلب، فطرت انسانی میں ودیعت کی گئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ایمان بالغیب کے بعد بھی حضور الوہیت میں سوال کرتے ہیں۔

رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی	اے رب! مجھے دکھا، تو مردے کیسے زندہ
(البقرہ، ۲:۲۶۰)	کرتا ہے۔

یہ سوال عدم ایمان کی بنا پر نہیں بلکہ حصول ایقان و اطمینان کی خاطر ہے۔

خود فرماتے ہیں۔

وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ یہ طلب مشاہدہ اطمینان قلب کے لئے ہی تو تھی جس کی حاجت خدا کا برگزیدہ نبی محسوس کر رہا ہے۔

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر مذکور ہے۔

وَ کَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰہِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ لِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ	اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی سیر کراتے تھے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

(الانعام' ۶:۷۵)

ابراہیم علیہ السلام کو اہل ایقان بنانے کی خاطر آسمانوں اور زمینوں کے ملکوت کا مشاہدہ کرایا جا رہا ہے۔ گو "ایمان بالغیب" سے یقین ہو جاتا ہے اور یہ اشارہ **یومنون بالغیب** میں مضمر ہے تاہم درجہ ایقان (کمال یقین) اپنی جگہ مسلم ہے اور اس کے لئے مشاہدہ درکار ہے۔ خدا کے لئے مومنین کی مدد اس کا حق ہے اور اس کی جانب سے فتح و نصرت اور کامیابی و کامرانی کا حاصل ہونا تمام مسلمانوں کا عقیدہ و ایمان ہے مگر حصول ایقان کی خاطر اس ایمان کے نتائج کا مشاہدہ یوں کرایا جا رہا ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ○ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (النصر' ۱۱۰:۱-۲)	جب خدا کی مدد آ گئی اور فتح حاصل ہو گئی اور تو دیکھے کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔

ایمانی حقیقت (نصرت الٰہی) کے نتیجے کا مشاہدہ حاصل ہو جانے کے بعد اب تلقین عمل کی جا رہی ہے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ ط اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا (النصر' ۱۱۰:۳)	پس تو اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ پاکی بیان کر اور استغفار کر' بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

بظاہر یہ خطاب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے مگر عمومی طور پر اسلامی

معاشرے کے وہ تمام افراد مخاطب ہیں۔ جنہوں نے فتح مکہ کے نتائج دیکھے تھے۔ ثابت ہوا کہ قرآن نے خود حصول یقین اور اطمینان قلب کا طریق یہ بتایا ہے کہ ایمانی حقائق کے نتائج کا مشاہدہ ہو تاکہ "رسوخ فی الایمان" نصیب ہو سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایمانی حقائق کے نتائج کا مشاہدہ کیونکر ممکن ہے؟ رموز سر دین اور اسرار شریعت پر آگہی رکھنے والے اکابرین امت اس امر پر متفق ہیں۔ کہ تصوف جو مذہبی واردات کی حیثیت رکھتا ہے۔ "حصول ایقان" "رسوخ فی الایمان" اور پختگی اعتقاد کا واحد ذریعہ ہے کیونکہ تصوف میں اخلاص و محبت سے چلنے والا ہر انسان ایمانی حقائق کے نتائج کا مشاہدہ کرتا ہے۔

امام غزالیؒ مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس دعویٰ کی صحت وحقانیت کے سب سے بڑے حامی و مؤید ہیں۔ وہ ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر تصوف وطریقت کو "رسوخ فی الایمان" کا واحد ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

امام ابو حامد غزالیؒ کی رائے اس سلسلے میں ملاحظہ ہو۔

فاما الذوق فهو كالمشاهدة والاخذ باليد و لا يوجد الا في طريق الصوفية (المنقذ من الضلال: ۵۹)	اور جہاں تک ذوق کا تعلق ہے تو اس کی حقیقت آنکھوں سے کئے ہوئے مشاہدے اور ہاتھوں سے محسوس کئے ہوئے کام کی طرح ہے اور یہ ذوق صرف طریقہ صوفیہ میں پایا جاتا ہے۔

ایک اور مقام اس تصوف کی نسبت فرماتے ہیں۔

فهذا هو منهاج تحصيل العلم الضروري	پس علم ضروری کی تحصیل کا یہی طریقہ (منہاج) ہے۔

(المنقذ من الضلال: ۷۵)

آپ صوفیہ کے مشاہدہ کی نسبت فرماتے ہیں۔

و من اول الطريقة تبتدئ	اور ابتداء طریقت میں مکاشفات

المکاشفات و المشاھدات حتی انھم فی یقظتھم لیشاھدون الملائکۃ و ارواح الانبیاء و یسمعون منھم اصواتا و یقتبسون منھم فوائد
(المنقذ من الضلال:۵۰)

ومشاہدات شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عین حالت بیداری میں وہ ملائکہ اور ارواح انبیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان کی آوازیں سنتے اور ان سے کسب فیض کرتے ہیں۔

امام غزالیؒ اسی باب میں آگے چل کر فرماتے ہیں۔

و ھذہ حالۃ یتحققھا بالذوق من سلک سبیلھا..... و من جالسھم استفاد منھم ھذا الایمان فھم القوم لا یشقی جلیسھم
(المنقذ من الضلال:۵۱)

اور یہ وہ حالت ہے۔ جس کا سالک کو ادراک ذوق سے ہوتا ہے..... اور جو کوئی ان کے پاس اٹھے بیٹھے گا۔ وہ ان سے اسی طرح کے ایمان کا ثمر پائے گا..... یہی وہ لوگ ہیں۔ جن کی صحبت میں بیٹھنے والا نامراد نہیں ہوتا۔

لہٰذا جب تصوف کی وساطت سے اعتقاد علم اور عمل باہم یکساں اور سازگار ہو جائیں تو کوئی سبب نہیں کہ انسانی سیرت ضبط وانقیاد کا نمونۂ کامل نہ بنے۔ اس طرح جب نفس انسانی تصوف (مذہبی واردات) کا انفرادی طور پر محتاج ہے تو معاشرہ اس کی ضرورت وحاجت سے کیونکر بے نیاز ہو سکتا ہے۔ جیسے سیرت وشخصیت والے افراد کا اجتماع اداراتی صورت میں موجود ہو گا۔ اسی قسم کا معاشرہ قائم ہو گا۔ اور اسلام جب کہ صالحیت اور نظم وضبط کے اعتبار سے ایک مثالی معاشرہ کا متقاضی ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا ہی ہو گا۔ کہ اسلامی معاشرہ اپنے صحیح اسلامی وجود' بقااور ترقی واستحکام کے لئے مزکی ومصفی اور منقاد افراد کا حاجت مند ہے۔ چونکہ افراد کا یہی تزکیہ وتصفیہ ہی طریق تصوف ہے پس اسلامی معاشرہ کسی صورت میں بھی تصوف کی ضرورت واحتیاج سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

مذہبی واردات کیا ہیں؟

ہم نے تصوف کو مذہبی واردات کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ لیکن یہ امر قابل وضاحت ہے کہ مذہبی واردات کیا ہیں۔ مذہبی واردات کی وضاحت کے لئے ہم "تنقیدی منہاج" استعمال کرتے ہیں۔ تنقیدی منہاج کے چار مدارج ہیں۔

۱۔ **امتیاز:** مماثل فضائل اور موضوع زیر بحث کے درمیان فرق و امتیاز۔

۲۔ **تعینات:** موضوع زیر بحث کی ماہیت کا تعین۔

۳۔ **تضمنات:** ان تضمنات کی وضاحت جس پر موضوع کے واقعہ بننے کا انحصار ہے۔

۴۔ **حدود صحت:** موضوع زیر بحث کی صحت کے حدود۔

اس تنقیدی منہاج کے مطابق تصوف بطور مذہبی واردات اور اس (تصوف) کے مماثل ایسے فضائل کے درمیان امتیاز کرنا مقصود ہے۔ جن کی نسبت یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ بھی مذہبی واردات ہیں۔ مثلاً

(i) مذہبی واردات اور خرق عادات کے مابین امتیاز۔

(ii) مذہبی واردات اور اخلاقی فضائل کے مابین امتیاز۔

(iii) ولایت اور نبوت کے مابین امتیاز۔

(i) خرق عادات یا خوارق ان واقعات کا نام ہے جن کی علت سمجھ میں نہ آئے۔ مثلاً بعد مسافت پر ہونے والے واقعات کا بلاواسطہ علم، مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کا قبل از وقت علم، دل کی پوشیدہ باتوں کا کشف، بغیر دوا کے مریض کا فوری طور پر شفایاب ہو جانا، مردہ کو زندہ کر لینا الغرض یہ سب خوارق (کرامات حسیہ) ہیں۔ خوارق وہبی بھی ہو سکتے ہیں اور کسبی بھی۔ اگر وہبی ہوں تو تصوف کی زبان میں "کرامت" کہلاتے ہیں اور کسبی ہوں تو "استدراج" دونوں صورتوں میں سے کسی کی حیثیت بھی مذہبی واردات کی نہیں ہے۔ مذہبی واردات کا اطلاق بندے اور خدا کے درمیان "نسبت" کے متحقق ہونے پر ہوتا ہے۔ مذہبی واردات کا حامل انسان "صاحب ولایت"

ہوتا ہے اور صاحب ولایت کے لئے صاحب خوارق ہونا ضروری نہیں۔

(ii) جو اعمال امر و نہی کو واجب العمل سمجھ کر ان کے اتباع میں صادر ہوں وہ اخلاقی فضائل ہیں اور جو افعال ان کی خلاف ورزی میں سرزد ہوں وہ اخلاقی رذائل کیونکہ قرآن مجید کی رو سے "حکم" معیار ہے۔ ارادی فعل کی نیت کا اتباعِ حکم سے متعین ہونا "حسن نیت" ہے اور حکم کی خلاف ورزی نیت سے متعین ہونا "سوءِ نیت" ہے۔ تزکیۂ نفس کے میلان انحراف پر غالب آئے بغیر اخلاقی فضائل کا حصول محال ہے۔ تاہم جو اخلاقی فضائل' تزکیہ کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ ارادی واختیاری ہونے کی بنا پر فضائل اخلاق ہی ہیں۔ مذہبی واردات نہیں کیونکہ مذہبی واردات' بندے اور خدا کے درمیان نسبت کا تحقق ہے اس لئے اوامر ونواہی کا اتباع نفس کے "راضیہ و مرضیہ" کے درجہ پر فائز ہونے کے بعد جب تک اضطرارًا صادر نہ ہونے لگے وہ اخلاق ہی رہے گا۔ مذہبی واردات نہ ہوگا۔ فضائل اخلاق مذہبی واردات کی صورت اس وقت اختیار کریں گے۔ جب ان کا صدور تعلق باللہ کے نتیجہ میں اضطرارًا (غیرارادی طور پر) یعنی از خود ہونے لگے۔ ارادہ واختیار کے بغیر ہی اوامر کی بجا آوری ہونے لگے اور نواہی سے ازخود اجتناب ہونے لگے۔ اسی لئے صاحب ولایت سے خلاف شریعت اعمال کا صدور نہیں ہوتا۔

(iii) تصوف یا مذہبی واردات کا منتہاء "مقام ولایت" ہے۔ بادی النظر میں ولایت اور نبوت دونوں مذہبی واردات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر ان دونوں کمالات کے درمیان فرق وامتیاز ہے۔ نبوت فضل محض اور وہب خالص ہے۔ اور ولایت میں کسب کو دخل ہے۔ نبوت کا خاصہ صحو محض ہے۔ اور ولایت میں سکر شامل ہے۔ نبوت کے تمام معارف حتمی' قطعی اور یقینی ہیں اور ولایت میں بعض ظنی' نبوت کے تمام حقائق کی حیثیت حقائق نفس الامری کی ہے اور ولایت کے حقائق کی حیثیت باطنی کیفیات کی ہے۔ نبوت کے معارف تبلیغ کے لئے ہیں۔ لہٰذا قال ہیں اور ولایت کے معارف حال ہیں۔ اس لئے ابلاغ واظہار سے ماوراء ہیں۔ صاحب نبوت کی توجہ لوگوں کے اصلاح حال کی

طرف مرکوز رہی ہے۔ یعنی نبی کی توجہ الی الخلق ہے اور صاحب ولایت کی توجہ ذات وصفات الوہیت پر مرکوز ہے یعنی ولی کی توجہ الی الخالق ہے۔ صاحب نبوت خود لوگوں کی تلاش میں ہے اور لوگ صاحب ولایت کی جستجو میں ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ مذہبی واردات کی ماہیت بندے اور خدا کے درمیان نسبت کا شعور و تحقق ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر "ماہیت اسلام" کا شعور و تحقق مذہبی واردات (تصوف) کہلاتا ہے۔ اور یہ شعور پوری انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور عملی زندگی کا ایک خاص انداز اس نسبت کے متحقق ہونے کا شاہد ہے۔ چونکہ افراد کی شخصیت اپنے نمونے کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ اور اس اختلافِ نوعیت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ شعور کے تین پہلو ہیں۔ جذبہ' ارادہ اور ادراک۔ کسی کے شعور میں جذبے کا پہلو غالب ہوتا ہے تو اس کے اور خدا کے درمیان نسبت کی نوعیت "نسبت محبت" ہوتی ہے۔ محبت میں طالب و مطلوب کے ایک ہو جانے کی آرزو' کمال قرب کی آرزو ہے۔

بقول امیر خسرو

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس نسبت سے محبوب کی ذات وصفات میں انہماک واستہلاک کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور "انا" کا شعور زائل ہو جاتا ہے۔ اس نسبت محبت، کو "ولایت عیسوی" کہتے ہیں۔ جس سالک کے شعور میں ارادے کا پہلو غالب ہو اس کے اور خدا کے درمیان "نسبت اطاعت" متحقق ہوتی ہے۔ اور سراسر مطیع ہو جانا مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔

بقول حافظ شیرازی۔

گر تیغ بارد در کوئے ماہ
گردن نہادیم الحکم للہ!

اس نسبت، کے متحقق ہونے کو "ولایت موسوی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس

سالک کے شعور میں ادراک کا پہلو غالب ہو اس کے اور خدا کے درمیان "نسبت معرفت" متحقق ہوتی ہے۔ اور ذات حق کا ادراک و معرفت مطلوب و مقصود ہو جاتا ہے۔

بقول سعدی شیرازیؒ۔

ایں رمق نیزکہ ہست از وجود
پیش وجودت نہ توانِ گفت ہست ،

تصوف کی زبان میں اس "نسبت معرفت" کو "ولایت ابراہیمی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ نسبتیں بہ اعتبار ایک دوسرے سے مختلف و متمیز ہیں۔ مگر یہ امتیاز صرف ابتداء میں ہی پایا جاتا ہے۔ ایک اور ہمہ گیر نسبت جس میں نہایت متوازن و متناسب انداز سے شعور کے تینوں پہلوؤں کو نمائندگی حاصل ہے۔ "نسبت عبودیت" ہے۔ اس نسبت کا حامل "صاحب ولایت محمدی" کہلاتا ہے۔ جب روحانی ارتقاء شروع ہو جائے تو زندگی میں یا بعد الموت ہر نسبت اپنے کمال کو پہنچ کر نسبت عبودیت پر منتہی ہوتی ہے۔

حصول نسبت کے دو راستے ہیں۔

۱۔ راہ اجابت (جذب)

۲۔ راہ انابت (سلوک)

جیسا کہ اس آیت پاک سے ظاہر ہے۔

اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یُّنِیۡبُ	اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے اور جو (ہدایت) طلب کرے اسے ہدایت عطا فرماتا ہے۔
(الشوریٰ ۴۲: ۱۳)	

جو لوگ اجابت کی راہ سے آتے ہیں۔ "مراد" کہلاتے ہیں۔ انہیں تو مشقت میں مبتلاء نہیں کیا جاتا۔ یا وہ شرائط جو حصول نسبت کے لئے ضروری ہیں ان پر آسان کر دیے جاتے ہیں جو لوگ انابت کی راہ سے آتے ہیں۔ "مرید" کہلاتے ہیں۔ یہ

سالکین بتائید الٰہی اپنے عزم وارادہ سے انتہائی جدوجہد کر کے سب مشکلات سے گزر کر کمال پر فائز ہوتے ہیں۔

نسبت کی نوعیت کا انحصار سالک کی انفرادی شخصیت کی اس خصوصیت پر ہے کہ اس کے شعور میں جذبہ ' ارادہ اور ادراک کے تینوں پہلوؤں میں سے کون سا پہلو غالب ہے۔ اس طرح ہر سالک کی واردات یعنی اس نسبت کے حصول اور اس کے تابع اس کی باطنی کیفیات کی حیثیت انفرادی واردات کی رہتی ہے۔ اور ہر صاحب ولایت کو چونکہ واردات ' نسبت کی ایک مخصوص شکل میں عطا ہوتی ہیں۔ اس لئے اس سے مستفید ہونے والوں کی صلاحیت ان کی اپنی احتیاج اور شخصیات کے نمونوں کے حوالوں سے متعین ہوتی ہے۔ اسی لئے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ نسبت کے مختلف النوع ہونے کی وجہ سے بعض شیوخ سے بعض طالبوں کو جیسا فیض درکار ہو حاصل نہیں ہوتا۔ یہ صورت حال دونوں کے اخلاص کے باوجود پیش آسکتی ہے۔ اور نسبت کا بدلنا خالصتاً شیخ کے روحانی تصرف کا نتیجہ ہوگا اور اس طرح اس طالب کو حصول فیض باطنی کے لئے کہیں اور رجوع کرنے کی حاجت نہ ہوگی اور مطلوبہ فیض اپنے شیخ سے ہی حاصل ہو سکے گا۔

فطرت انسانی میں جب خدا طلبی کا داعیہ بیدار ہوتا ہے۔ تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ بندے اور خدا کے درمیان جو نسبت ہے وہ متحقق ہو جائے۔ اس کے لئے جدوجہد کا متقضہ یہ ہے کہ انسان میں کوئی استعداد ایسی ضرور موجود ہے جس سے یہ نسبت بالفعل پیدا ہو جائے۔ وہ استعداد "وجدان" ہے۔ اگر وجدان کی استعداد تزکیہ کے بعد نشوونما پائے تو بیک وقت محسوسات' معقولات اور ورائے معقولات حقائق کے ادراک کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ جس طرح حواس خمسہ ظاہری (سامعہ ' باصرہ ' ذائقہ ' شامہ ' لامسہ) محسوسات کے علم کا ذریعہ ہیں اور حواس خمسہ باطنی (**متخیلہ ' حافظہ ' متوہمہ ' متصرفہ ' حس مشترک**) ورائے محسوسات کے ادراک کا ذریعہ ہیں۔ اسی طرح صوفیا کے نزدیک لطائف خمسہ (لطیفہ قلب ' لطیفہ روح ' لطیفہ سر ' لطیفہ خفی ' لطیفہ

اخفی) ورائے معقولات کے ادراک کا ذریعہ ہیں۔ تعلق باللہ انسان کی فطرت میں موجود ہے مگر نفس کا تزکیہ نہ ہونے سے اس تعلق کا ادراک و شعور اس لئے نہیں ہوتا کہ خواہشات نفسانی حجاب بنی رہتی ہیں۔

درحقیقت یہ حجابات ابتدائے خدا طلبی کی راہ میں سازگار شرط ہیں۔ ان کی وجہ سے خوابیدہ عزم بیدار ہوتا ہے۔ نفس خوگر آلام ہوتا ہے۔ انسان ان نفسانی حجابات کی ظلمت سے آشنا ہو کر اس ظلمت کو نور سے بدلنا چاہتا ہے۔ ریاضت و مجاہدہ کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اس کی طبیعت ضبط و انقیاد کی عادی بنتی ہے۔ آخر کار یہ حجابات نفسانی رفع ہو جاتے ہیں۔

ان حجابات کے اٹھ جانے سے سالک کی طبیعت میں خاص نسبت کا تحقق ہو جاتا ہے۔ باطن کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ جس سے روحانی حقائق منکشف ہو جاتے ہیں۔ اور لطائف کی زبان کھل جاتی ہے۔ جس سے روحانی معارف بیان ہونے لگتے ہیں۔



فصل سوم

۱۔ دین اسلام کے دو پہلو

۲۔ ربط بین الشریعت والطریقت

۳۔ مقاصد طریقت

(i) تزکیۂ نفس

(ii) تصفیۂ قلب

(iii) معرفتِ ربّانی

دین اسلام کے دو پہلو

دین اسلام کے دو پہلو ہیں:۔

ا۔ معیاری دین: یہ عالمی سطح پر غلبہ اسلام کی جدوجہد کا نام ہے۔

۲۔ معمول بہ دین: یہ شریعت و طریقت پر مشتمل دین کی ظاہری و باطنی تعلیمات کا نام ہے۔

اگر شریعت و طریقت میں سے کسی ایک کا فقدان ہو تو معمول بہ دین نامکمل وناتمام رہتا ہے۔ شریعت کا تعلق ان احکام اور انفرادی واجتماعی امور سے ہے جن کی بنا پر فرداور جماعت کی خارجی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ عبادات ومعاملات دو انواع پر منقسم ہیں۔ جبکہ طریقت کا تعلق ان روحانی لذات اور معنوی کیفیات سے ہے جو طاعت ونیکی کے نتیجہ میں انسان کے دل پر مرتب ہوتی ہیں۔ اسے ہی عام زبان میں "تصوف" کہا جاتا ہے۔ شریعت و طریقت اپنی اپنی ذات میں مستقل ہونے کے باوجود باہم لازم وملزوم ہیں۔ ان مین جدائی وافتراق ناممکن ومحال ہے۔

بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی "شریعت و طریقت کے درمیان کوئی تخالف یا تضاد مطلق نہیں بلکہ سب اکابر طریقت نے تصریح کی ہے کہ کمال شریعت ہی کا نام طریقت ہے۔ اتباع رسول ﷺ جب تک محض ظواہر تک محدود رہے اس کا نام شریعت ہے' اور جب قلب وباطن بھی نورانیت رسول ﷺ سے منور ہو جائے تو یہی طریقت ہے جس شخص نے نماز کتب فقہ میں مندرج قواعد کے مطابق پڑھ لی شریعت کی روسے یہ نماز مکمل ہو گئی مگر طریقت اسے کافی نہ سمجھے گی وہ اس پر مصر ہو گی کہ جس طرح چہرہ کعبہ کی جانب متوجہ رہا۔ قلب بھی رب کعبہ کی جانب متوجہ رہے اور جس طرح جسم حالت نماز میں ظاہری نجاستوں سے پاک رہا روح بھی باطنی آلائشوں اور

پریشان خیالیوں سے پاک رہے۔ یہ شریعت کی مخالفت ہوئی یا منشائے شریعت کی عین کی تکمیل"؟ مذکورہ بحث کا منبع دراصل وہ متفق علیہ حدیث ہے جسے محدثین۔ "حدیث جبرائیلؑ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

قال ماالایمان قال الایمان ان تومن باللہ و ملائکتہ و رسلہ و تؤمن بالبعث قال ماالاسلام قال الاسلام ان تعبد اللہ و لاتشرک بہ و تقیم الصلوٰۃ و تؤدی الزکوٰۃ المفروضۃ و تصوم رمضان قال ماالاحسان قال الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

(صحیح البخاری '۱:۱۲)

حضور ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر اس کے فرشتوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور تو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر بھی یقین رکھے پوچھا گیا اسلام کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرے اور نماز قائم کرے اور فرض زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان المبارک کے روزے رکھے پھر سائل نے پوچھا۔ احسان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تو اس طرح خدا کی عبادت کرے کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو خدا کو نہیں دیکھ رہا تو خدا تو تجھے دیکھ رہا ہے۔

حدیث مذکورہ میں مرد مومن کے تین درجات بیان ہوئے ہیں۔

ایمان' اسلام' اور احسان۔ ایمان و اسلام عقیدہ و عمل کا نام ہے۔ اور اس سے ماوراء بھی ایک مقام ہے جسے "اصطلاح حدیث" میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اسے ہی سلوک و تصوف اور طریقت کا نام دیتے ہیں۔

(ہمعات: ۴۶۔ ۴۴)

قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر چہارگانہ فرائض نبوت بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْہِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْہِمْ وَ یُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ

(آل عمران، ۳: ۱۶۴)

اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ اہل ایمان پر بہت بڑا احسان کیا۔ جب انہیں میں سے اپنا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھیجا جو ان پر اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

آیت مذکورہ کی رو سے چہارگانہ فرائض نبوت بالترتیب یہ قرار پائے۔

۱: تلاوت آیات

۲: تزکیۂ نفس

۳: تعلیم کتاب

۴: تعنیم حکمت

پہلا اور تیسرا شریعت کے فرائض ہیں۔ اور دوسرا اور چوتھا طریقت کے۔

قرآن حکیم میں اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَ یُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ

(البقرہ، ۲: ۱۵۱)

اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

اس آیت میں یعلمکم کے فعل کا تکرار موجود ہے اسی نکتہ کی وضاحت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ یوں کرتے ہیں۔

تکرار الفعل یدل علی ان ھذا التعلیم من جنس اخر ولعل المراد بہ العلم اللدنی

(التفسیر المظہری، ۱: ۱۴۹)

فعل یعلمکم کا تکرار اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ یہ تعلیم دوسری قسم کی ہے اور شاید اس سے مراد "علم لدنی" ہے۔

شریعت جس علم کا ظاہر ہے طریقت اس کا باطن ہے۔ جسے علم لدنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علم لدنی کا استشہاد قرآن کی اس آیت سے ہوتا ہے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا
(الکہف '۱۸:۶۵)

پس انہوں نے وہاں ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت عطا کی ہوئی تھی۔ اور اپنے پاس سے علم (علم لدنی) عطا کیا تھا۔

علم لدنی کا ادراک مطالعہ کتب سے نہیں بلکہ صحبت عرفاء سے ہوتا ہے اسی لئے طریقت میں ارادت شیخ کو فرض اولین کا مرتبہ حاصل ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی" فرماتے ہیں:

العلم اللدنی الماخوذ من بطون القرآن و من مشکوٰۃ صدر النبی الذی لا سبیل الی درکہ الا الانعکاس واما درک درکہ فبعید من القیاس

علم اللدنی کے حصول کا ذریعہ قرآن کا باطن ہے اور حضور نبی اکرم ﷺ کا سینہ اطہر ہے اس علم اللدنی کے حصول کا فقط واحد ذریعہ انعکاس ہے اس کے ادراک کا پتہ چلانا قیاس سے بعید ہے۔

(التفسیر المظہری '۱:۱۴۹)

علم باطن اور علم ظاہر کی وضاحت احادیث رسول ﷺ سے بھی ہوتی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

قال حفظت من رسول اللہ ﷺ وعائین فاما احدھما فبثثتہ واما الاخر فلو بثثتہ قطع ھذا البلعوم
(صحیح بخاری '۱:۲۳)

فرمایا میں نے حضور ﷺ سے دو علوم سیکھے ہیں۔ پہلا علم میں نے تم پر بیان کر دیا اور اگر دوسرا بیان کر دوں تو یہ گردن اڑا دی جائے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی" حدیث کی شرح "لمعات" میں یوں بیان فرماتے ہیں۔ کہ پہلا علم احکام و اخلاق کا ہے۔ اور دوسرے علم سے مراد اسرار و غوامض کا علم

ہے جو اغیار کے لئے ناقابل ادراک ہے اور وہ صرف اہل عرفان کے لئے مختص ہے۔

(حاشیہ مشکوٰۃ:۲۹)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ انزل القران علی سبعۃ احرف لکل ایۃ منہا ظاہر و باطن و لکل حد مطلع	حضور ﷺ نے فرمایا: قرآن سات مفاہیم پر نازل ہوا ہر آیت کا اس میں سے ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حد کی اپنی ابتداء ہے۔
(مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۲)	

اس حدیث کی شرح میں علامہ طیبی فرماتے ہیں۔

لیس للحد والمطلع انتہاء لان غایتہما طریق العارفین باللہ و ما یکون سرا بین اللہ و بین انبیائہ و اولیائہ	کسی حد و آغاز کی انتہا نہیں ہے کیونکہ ان کی غایت عارفین کا رستہ ہے جو خدا اور انبیاء و اولیاء کے مابین ایک راز ہے۔

(مرقاۃ المفاتیح ۱:۲۴۳)

امام حسن بصری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال العلم علمان فعلم فی القلب فذاک العلم النافع و علم علی اللسان فذاک حجۃ اللہ علی ابن ادم	علم دو قسم کا ہے ایک قلب کا علم، پس یہی علم نافع ہے اور دوسرا زبان کا علم پس یہ بنی آدم پر حجت ہے۔

(مشکوٰۃ المصابیح: ۳۷)

ملا علی قاری حدیث مذکورہ کی شرح میں یوں رقم طراز ہیں:

قد یحمل الاول علی علم الباطن والثانی علی علم الظاہر	پہلا علم باطن ہے اور دوسرا علم ظاہر ہے۔

(مرقاۃ المفاتیح، ۱:۲۵۶)

امام ابو نعیم اصفہانی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف ما منہا حرف الا ولہ ظہر و بطن و ان علی ابن طالب عندہ منہ الظاہر والباطن

(الاتقان، ۲: ۱۸۷)

قرآن حکیم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس کے ہر حرف کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس اس کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

مذکورہ بالا دلائل و براہین سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو گئی کہ شریعت و طریقت کا باہمی ربط ظاہر و باطن کا ربط ہے جس طرح کسی چیز کے ظاہر و باطن کو جدا کر کے اس کی ماہیت من حیث الکل متصور نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شریعت و طریقت کو منفصل کرنے سے دین اسلام کی ماہیت من حیث الکل معلوم نہیں ہو سکتی۔

ربط بین الشریعت والطریقت (صوفیہ کی نظر میں)

صوفیاء کرام نے شریعت و طریقت کو ہمیشہ لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اس موقف کی تائید میں چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

ا۔ امام مالک بن انس فرماتے ہیں:

من تفقہ و لم یتصوف فقد تفسق و من تصوف و لم یتفقہ فقد تزندق و من جمع بینہما فقد تحقق

(مرقاۃ المفاتیح، ۱: ۲۵۶)

جس نے علم فقہ حاصل کیا اور تصوف سے بے بہرہ رہا پس وہ فاسق ہوا اور جس نے تصوف کو اپنایا مگر فقہ کو نظر انداز کر دیا وہ زندیق ہوا اور جس نے دونوں کو جمع کیا پس اس نے حق کو پالیا۔

امام ابو القاسم القشیری فرماتے ہیں:

کل شریعۃ غیر مؤیدۃ بالحقیقۃ فغیر مقبول و کل حقیقۃ غیر مقیدۃ بالشریعۃ فغیر محصول

(الرسالۃ القشیریہ: ۴۳)

جس شریعت کو حقیقت کی مدد حاصل نہ وہ غیر مقبول ہوتی ہے اور جو حقیقت شریعت سے مقید نہ ہو، وہ غیر حاصل رہتی ہے۔

۳۔ شیخ ابو طالب مکی صاحب ''قوت القلوب'' شریعت و طریقت کی نسبت فرماتے ہیں۔

هما علمان اصلیان لا یستغنی احدهما عن الاخر بمنزلة الاسلام و الایمان مرتبط کل منهما بالاخر کالجسم والقلب لاینفک احد من صاحبه

(مرقاة المفاتیح' ۱:۲۵۶)

دونوں ایسے علوم ہیں جن میں سے کوئی ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ جیسے اسلام اور ایمان کہ ان میں سے ہر ایک مرتبط ہے اور یا جیسے جسم اور قلب کا رشتہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتا۔

۴۔ امام غزالیؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب ''**المنقذ من الضلال**'' تصنیف کی ہے۔ اور آپؒ نے ''**احیاء علوم الدین**'' میں ''**بیان شواهد الشرح علی صحة طریق اهل التصوف**'' کے نام سے ایک باب بھی اسی موقف کی تائید میں قائم کیا ہے۔

امام غزالیؒ شریعت و طریقت کے لازم وملزوم ہونے اور صحت طریق تصوف کے اثبات میں دلائل پیش کر کے آخر میں فرماتے ہیں:۔

لو جمع کل ماورد فیه من الآیات والاخبار والآثار لخرج عن الحصر

(احیاء علوم الدین' ۳:۲۰۔۲۱)

اگر اس ضمن میں مذکورہ آیات واحادیث اور آثار صحابہؓ کو جمع کیا جائے تو ان کا سلسلہ حصر سے باہر ہو جائے۔

۵۔ شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ فرماتے ہیں:

الشریعة ظاهر الحقیقة والحقیقة باطن الشریعة و هما متلازمتان لایتم احدهما الآ بالاخر

(شرح الرسالة القشیریه: ۴۳)

شریعت ظاہر حقیقت ہے اور حقیقت شریعت کا باطن ہے اور وہ باہم لازم وملزوم ہیں' ان میں سے کوئی دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

۶۔ شیخ زروق فرماتے ہیں:

لنسبة التصوف من الدین نسبة

تصوف کا دین میں مقام وہی ہے جو روح

الروح من الجسد | کا بدن میں ہوتا ہے۔

(ایقاظ الهمم ۱:۸)

۷۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

الطریقۃ والشریعۃ متلازمان لان الطریق الی اللہ لها ظاهرها و باطنها فظاهرها الشریعۃ و الطریقۃ و باطنها الحقیقۃ

(رد المحتار، ۳: ۳۰۳)

شریعت اور طریقت باہم لازم و ملزوم ہیں کیونکہ اللہ کی طرف جانے والے راستے کا ایک ظاہری حصہ ہے اور ایک باطنی۔ ظاہری حصہ شریعت اور طریقت ہے اور باطنی حصہ حقیقت ہے۔

۸۔ شاہ اسماعیل دہلوی لکھتے ہیں:

"شریعت کے لئے ایک باطن ہے اور وہ تعلق دل کا ہے حضرت حق جل وعلا سے اور اس کے مختلف انحاء اور ڈھنگ ہیں۔ ان انحاء میں سے ہر ایک کا نام "نسبت" رکھا جاتا ہے۔ اور ایک شریعت کا ظاہر ہے وہ اوامر شریعہ کا بجالانا اور منہیات سے باز رہنا ہے ان تعلقات قلبی اور افعال ظاہری کے دوران ایک نہایت باریک علاقہ ہے"

(صراط مستقیم (اردو): ۱۳)

۹۔ سیدنا طاہر علاء الدین الگیلانی القادری البغدادیؒ فرماتے ہیں:

"شریعت بلا حقیقت ریا ہے اور حقیقت بلا شریعت گمراہی ہے"۔

ارشاد ربانی ہے:۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

(العنکبوت ۲۹:۶۹)

اور جو ہمیں راضی کرنے کے لئے (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں۔ ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھادیں گے۔

"پس شریعت مجاہدہ ہے اور ہدایت و مشاہدہ اس کی حقیقت جو بالفاظ دیگر ظاہر کی باطنی رہنمائی ہے۔ پس جب مجاہدہ نہ ہو گا۔ تو مشاہدہ کیسے حاصل ہو گا۔ جب شریعت ترک کر دی جائے گی تو حقیقت کے وارد ہونے کا کیا معنی۔ لہٰذا ہر دو لازم ملزوم ہیں"

(تذکرۃ القادریہ: ۳۶۲)

مقاصد طریقت

ہر فعل کے حسن وقبح کو ان امور پر غور کرنے سے جانچا جاتا ہے ‘ کہ

(i): اس فعل کی غرض وغایت کیا ہے؟

(ii): اس کے ارتکاب کا نتیجہ کیا ہے؟

(iii): اس سے اجتناب کا انجام کیا ہوگا؟

اب ہم اس معیار پر تصوف و طریقت کا جائزہ لیتے ہیں کہ تصوف کے مقاصد ونتائج کیا ہیں۔ اگر مقاصد طریقت قرآن وسنت کی روشنی میں محمود ہیں تو یہ مقبول اور اگر مذموم ہیں تو مردود۔

طریقت کے تین مقاصد ہیں۔

۱۔ تزکیۂ نفس

۲۔ تصفیۂ قلب

۳۔ معرفت ربانی

تزکیۂ نفس

نفس انسانی میں حیوانی قوتوں کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس روح ملکوتی قوتوں کی مظہر ہے۔ نفس ہی کے ذریعے تمرد وانحراف کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن حکیم اس حقیقت کی نسبت صراحت کے ساتھ اپنا موقف بیان کرتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی

(الاعلیٰ‘ ۸۷: ۱۴۔ ۱۵)

وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے خود کو پاک کر لیا اور اپنے رب کا نام پکارا اور نماز ادا کی۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا

(الشمس‘ ۹۱: ۹۔ ۱۰)

وہ شخص کامیاب ہوا جس نے خود کو پاک کیا اور وہ شخص ناکام ہوا جس نے اسے آلودہ کیا۔

اس آیت کی تفسیر میں امام حسن بصری فرماتے ہیں:

قد افلح من زکی نفسہ و اصلحھا و حملھا علی طاعۃ اللہ
(معالم التنزیل علی ہامش الخازن ۷:۲۱۰)

وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا اور اس کی اصلاح کر لی اور اس کو اللہ کی اطاعت پر آمادہ کر لیا۔

قرآن مجید خود اصلاح نفس پر زور دیتا ہے۔

وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی
(النازعات ۷۹:۴۰۔۴۱)

اور جس نے اپنے نفس کو خواہشات کی تکمیل سے روکا پس جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مناسب طریق پر تضعیف بہیمیت اور تقویت ملکوتیت کا انتظام کیا جائے تاکہ نفس انسانی اور خود اخلاقی حکم کی خلاف ورزی کی بجائے اخلاقی حکم کی بجا آوری پر آمادہ ہو یعنی وہ تسلیم و رضا کے زیور سے مزین و آراستہ ہو جائے۔ قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ
(یوسف ۱۲:۵۳)

بے شک نفس تو سرکش ہے برائی میں، مگر وہی جس پر میرا رب رحم کرے۔

ارشاد ربانی ہے۔

وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ
(البقرہ ۲:۱۳۰)

اور ملت ابراہیم سے وہی اعراض کرتا ہے جس کا نفس احمق ہے۔

شیخ ابو طالب مکی فرماتے ہیں کہ ”نقصان کا آغاز غفلت سے ہوتا ہے۔ اور غفلت آفات نفس سے پیدا ہوتی ہے“

(قوت القلوب ۱:۱۷۴)

بقول شخصے

ماندم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ منزل دور شد

اس لئے آفات نفس سے نجات و فلاح اس کے تزکیہ و تربیت اور اصلاح و تطہیر ہی سے ممکن ہے۔

تصوف نفس کی اصلاح و تطہیر کا اہتمام کرتا ہے اور جب نفس انسانی اصلاح پذیر ہو کر مزکی و منقاد ہو جاتا ہے۔ تو "**نفس لوامہ**" اور پھر "**نفس راضیہ و مرضیہ**" کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے اور یہاں بارگاہ الوہیت سے ندا آتی ہے۔

یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِی اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً
(الفجر' ۸۹:۲۷-۲۸)

نفس مطمئنہ تو اپنے رب کی طرف لوٹ جا' اس حال میں تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔

تزکیہ نفس کو حدیث میں "جہاد اکبر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے ایک غزوہ سے واپسی پر صحابہ کرامؓ سے فرمایا:

مرحبا بکم قدمتم من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر۔ قیل و ما الجهاد الاکبر قال جهاد النفس
(احیاء علوم الدین' ۳:۵۷)

تمہیں مرحبا ہو کہ تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہو۔ پوچھا گیا وہ بڑا جہاد کون سا ہے؟ فرمایا وہ نفس سے جہاد ہے۔

تزکیۂ نفس چہار گانہ فرائض نبوت میں شامل ہے۔

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ
(آل عمران' ۳:۱۶۴)

آپ (ﷺ) تلاوت فرماتے ہیں۔ ان پر اس کی آیات کی اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

حضور ﷺ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله — مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت کے بارے میں اپنے نفس سے جہاد کیا۔ (احیاء علوم الدین، ۴:۵۷)

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ واضح ہوا کہ طریقت کا مقصد اولین "تزکیۂ نفس" ہے جو قرآن و سنت کی نظر میں نہ صرف مستحسن بلکہ امر لابدی ہے۔

تصفیۂ قلب

اعمال قبیحہ کے ارتکاب سے قلب انسانی پر سیاہی و ظلمت غالب آ جاتی ہے اور اس طرح باطن تاریک ہو جاتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تصفیۂ تجلیہ باطن کا اہتمام کیا جائے تاکہ قلب انسانی نور معرفت الٰہی کا منبع و سرچشمہ بن سکے۔

قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ — ہرگز نہیں بلکہ ان کے کسب کی بنا پر ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔
(المطففین، ۸۳: ۱۴)

دلوں کے زنگ کا خاتمہ قرآن مجید کا مطلوب و مقصود ہے کیونکہ سارے اعضائے جسمانی دل کے ماتحت ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

و ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا و هی القلب — تحقیق جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اگر وہ اصلاح پذیر ہو جائے تو تمام جسم کی اصلاح از خود ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارے جسم میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ خبردار! وہ دل ہے۔
(صحیح بخاری، ۱: ۱۳)

نواب صدیق حسن بھوپالی اس باب میں ابو عثمان کا قول نقل کرتے ہیں:

"خشوع الظاهر مع فجور القلب یورث الاصرار"

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

کفی بالرجل شرا ان یری الناس انه — انسان کے لئے یہ شر کافی ہے کہ وہ لوگوں

یخشی اللہ و قلبہ فاجر

(الروض الخصیب: ۸۷)

پر یہ ظاہر کرے کہ وہ خدا سے ڈرتا ہے درآنحالیکہ اس کا دل فاجر ہو۔

قرآن مجید میں مذکور ہے۔

اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ ھُوَ شَہِیْدٌ

(ق، ۵۰:۳۷)

بے شک اس میں یاد دھانی ہے ہر اس شخص کے لئے جو قلب سلیم کا مالک ہو اور جو کان لگا کر سنے گواہ ہو کر۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اس آیت کے لفظ "قلب" کی تفسیر یوں کرتے ہیں۔

ای قلب صاف عن الصفات عن الکدورات صالح لتجلیات لہ لعینہ غیر متکفیۃ بالذات مشتغل باللہ فارغ عن غیرہ مصدق لحدیث قدسی لایسعنی ارضی و لاسمائی و لکن یسعنی قلب عبدی المومن و لایکون الا بعد الفناء المصطلح للصوفیۃ

(التفسیر المظہری، ۹:۵۷)

دل ہر قسم کے میل کچیل سے پاک اور صفاتی تجلیات جن کی کیفیت بیان سے باہر ہے کے حصول کے لئے استعداد وصلاحیت رکھتا ہو۔ اور وہ غیر سے فارغ ہو کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ شاغل ہو۔ اس کی تصدیق یہ حدیث قدسی کرتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نہ زمین میں سما سکتا ہوں۔ اور نہ آسمان میں۔ ہاں میں مومن بندے کے دل میں سما سکتا ہوں اور یہ مقام بقول صوفیا کرام کے مقام فنا کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر اصلاح قلب کی نسبت ارشاد ہے۔

یَوْمَ لَایَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَابَنُوْنٌ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ

(الشعراء، ۲۶:۸۸۔۸۹)

اس دن نہ تو مال فائدہ دے گا۔ اور نہ بیٹے مگر یہ کہ جو شخص اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

لکل شیئ صقالۃ و صقالۃ القلوب ذکر اللّٰہ — ہر شی کا کوئی نہ کوئی صیقل ہوتا ہے اور دلوں کا صیقل اللہ کا ذکر ہے۔

(مشکوٰۃ :۱۹۱)

ایک اور مقام پر فرمایا:

ان ھذہ القلوب تصدا کما یصدا الحدید فاجلوھا بذکر اللّٰہ — دلوں پر لوہے کی طرح زنگ لگ جاتا ہے۔ لہٰذا تم اس کے زنگ کو اللہ کے ذکر سے دور کرو۔

(تذکرۃ القادریہ:۲۶۷)

حضرت میمون بن مہران فرماتے ہیں:

فتری قلب المومن مجلوا مثل المرآۃ — پس تو دیکھے گا کہ مومن کا دل آئینے کی مانند چمکدار ہوتا ہے۔

(قوت القلوب'۱:۲۳۲)

جب مومن کا قلب مجلی و مصفی ہوتا ہے تو انوار الٰہیہ کا مہبط و منزل بن جاتا ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ **"قلب المومن عرش اللہ تعالی"**

قرآن حکیم میں مذکور ہے:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ — اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے' اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا طاقچے میں چراغ ہو۔

(النور' ۲۴:۳۵)

امام جلال الدین سیوطیؒ **"مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح"** کی تفسیر میں رقم طراز ہیں۔

ای صفتہ فی قلب المومن — یعنی اس کی صفت مومن کے دل میں ہے۔

(جلالین' ۲:۳۷)

امام خازنؒ فرماتے ہیں:

قیل وقع ھذا التمثیل لنور قلب المومن — بعض کہتے ہیں یہ مومن کے قلبی نور کی مثال ہے۔

(تفسیر الخازن' ۵:۶۵)

علامہ ابو القاسم زمخشری" فرماتے ہیں:

یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے۔ کہ تصفیہ قلب اور جلائے باطن قرآن و سنت کا مطلوب و مقصود ہے۔ لہٰذا طریقت کا یہ مقصد بھی مستحسن اور قابل ستائش ہے۔

معرفت ربانی

تصوف تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن پر اسی لئے زور دیتا ہے کہ اس کے ذریعے معرفت ربانی کی تحصیل ہوتی ہے۔

قرآن حکیم نے انسانی تخلیق کی غرض وغایت ہی **"معرفت رب"** کو قرار دیا ہے۔

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (الذاریات' ۵۱:۵۶)

اور میں نے جن وانس کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔

ابن جریج تابعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں" ای **لیعرفون**"

شیخ ابو محمد روزبہان بقلی شیرازی" فرماتے ہیں۔

قال جعفر الا لیعرفونی ثم لیعبدونی علی بساط المعرفۃ لیتبرأوا من الریاء

(عرائس البیان' ۲:۲۸۱)

جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری معرفت حاصل کریں اور پھر بربنائے معرفت میری عبادت کریں تاکہ ریا کا شائبہ نہ رہے۔

قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ

(المائدہ' ۵:۸۳)

اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں۔ جو رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نازل کیا جارہا ہے۔ تو تو دیکھے گا کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔

یہ (معرفت ربانی) وہ امتیازی خوبی ہے جس کے ذریعے عارف و غیر عارف کے مابین تمیز ہوتی ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِہٖ (الانعام ۶:۹۱)

اور انہوں نے اللہ کی جیسے قدر کرنی چاہیے تھی نہیں کی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے:

قال النبی ان دعامۃ البیت اساسہ و دعامۃ الدین المعرفۃ باللّٰہ تعالیٰ والیقین (الرسالۃ القشیریہ:۱۴۱)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ گھر اپنی اساس پر قائم ہوتا ہے اور دین کی اساس خدا کی معرفت اور اس کا یقین ہے۔

امام ابو القاسم قشیریؒ فرماتے ہیں:

من عرف اللّٰہ ذھب عنہ خوف المخلوقین و رغبۃ الاشیاء (الرسالۃ القشیریہ:۱۴۱)

جس نے اللہ کو پہچان لیا اس کے دل سے مخلوق کا خوف اور اشیاء کی رغبت ختم ہو جاتی ہے۔

طریقت کا تیسرا مقصد قرآن و سنت کی روشنی میں نہایت پسندیدہ ہے لیکن سوال یہ ہے۔ معرفت حق کیسے حاصل ہو؟

صوفیاء کرام کا نقطہ یہ ہے کہ معرفت حق کا واحد ذریعہ معرفت نفس ہے اس لئے تصوف کی جدوجہد معرفت نفس ہے اور نتیجہ معرفت حق۔

بقول حضرت بایزید بسطامیؒ

"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیدا است تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز او نیابی

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی رافاش تر دیدن بیاموز

اور بقول شخصے:

او در دل من است و دل من بدست اوست
چوں آئینہ بدست من و من در آئینہ

(وہ میرے دل میں جلوہ گر ہے اور میرا دل اس کے ہاتھ میں ہے۔ بالکل یوں جس طرح آئینہ میرے ہاتھ میں ہو اور میں آئینہ میں)



باب اول

تصوف کا معنیٰ و مفہوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن و سنت اسلامی تعلیمات کے ایسے منابع و سرچشمے ہیں جن کی حیات آفریں اور نورانی و عرفانی موجیں مرد مومن کی فکری و عملی اور اخلاقی و روحانی زندگی کی آبیاری کرتی ہیں اس چشمۂ صافی سے سیراب ہوئے بغیر اسلامی تعلیمات کا کامل فہم اور ان پر عمل ناممکن ہے گویا انسانی زندگی کو من کل الوجوہ ان تعلیمات کا پابند و مطیع بنا دینا ہی اس صراط مستقیم کو کاملا پا لینا ہے جس پر گامزن ہونے کی التجا انسان شعوری یا لا شعوری طور پر ہمہ وقت اپنے خالق سے کرتا ہے نماز کے اندر بتکرار صراط مستقیم پر چلنے کی دعا حصول ہدایت کے لئے اس کی اسی تڑپ کی دلیل ناطق ہے انسان کو صراط مستقیم دکھا دینے والی یہ تعلیمات وہ مینارۂ رشد و ہدایت ہیں جہاں سے ہر خیر اور بھلائی کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور طالبان خیر انہیں سے اکتساب نور کرتے یا پھر اس نور کے لئے کوشاں و سرگرداں رہتے ہیں۔

چنانچہ اگر ایک طرف قرآن حکیم ہم پر اسلام کی فکری و نظریاتی اساس اور معیارات آشکار کرتا ہے تو دوسری طرف سنت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام اس حیات بخش نظریے کو عملی زندگی میں جاری و ساری دیکھنے کے لئے منہج حیات اور معیاری نمونہ عمل عطا کرتی ہے۔ دور نبوی جو کہ ارشاد رسالت مآب ﷺ کی رو سے خیر القرون ہے دین متین کے معیارات کی تشکیل کرتا ہے۔ جبکہ دور مابعد نبوت جس میں علوم شریعت کی تدوین عمل میں آئی اور شریعت کے منتہائے کمال یعنی معرفت و وصل الٰہی کی منزلوں کو طے کرنے کے اصول وضع کئے گئے دین کے عملی نظام کی تفصیلات مہیا کرتا ہے۔

"شریعت دراصل قرآن و سنت پر مبنی اوامر و نواہی کا وہ نظام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے عمل کو منضبط کرتا ہے"۔

جبکہ اس عمل کو حسن نیت اور حسن اخلاص کے کمال سے آراستہ کر کے اتباعِ شریعت کو درجۂ احسانؐ[۱] پر فائز کرنے کی سعی و تدبیر کا نام تصوف ہے۔

لفظ تصوف کی لغوی تحقیق

تصوف کے مادۂ اشتقاق اور لفظ صوفی کی وجہ تسمیہ کے باب میں علمائے کبار کے مختلف اقوال ہیں: اہل علم نے تصوف کے درج ذیل مادہ ہائے اشتقاق بیان کئے ہیں۔

قول اول الصفاء:

بعض علماء کے نزدیک تصوف کا مادہ اشتقاق الصفاء ہے جس کے معنی صفائی اور پاکیزگی کے ہیں اس مادہ اشتقاق کی رو سے کسی شے کو ہر طرح کی ظاہری و باطنی آلودگی سے پاک صاف کر کے اجلا اور شفاف بنا دینا تصوف ہے۔

شیخ ابو الفتح بستی تصوف کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان التصوف کلمۃ اشتقت من الصفاء (الشیخ ارسلان الدمشقی:۳۹)

تصوف وہ کلمہ ہے جو صفا سے مشتق ہے جس کا معنی صفائی ہے۔

صاحب المنجد لفظ تصوف کی شرح بیان کرتے ہیں۔

صفی ای تصفیۃ الشیئ وجعلہ صافیا (المنجد تحت مادہ صفا)

صفی سے مراد کسی شے کو صاف اور اجلا کر دینا ہے۔

۱۔ اشارہ ہے معروف حدیث جبریل کی طرف جو اسلام کے اعتقادی، عملی اور روحانی نظام کے لئے بمنزلہ اساس ہے: حضرت جبرائیل امین نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں احسان کے متعلق سوال کیا۔

قال ما الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

(صحیح بخاری، ۱: ۱۲)

(کہا احسان کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا یہ کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھتا ہے اور اگر تو اسے نہ دیکھ پائے تو کم از کم وہ تجھے دیکھتا ہے)

حضرت داتا گنج بخش مخدوم علی ہجویری نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کشف المحجوب میں شیخ خضری کا یہ قول نقل کیا ہے۔

التصوف صفاء السر من کدورۃ المخالفۃ	باطن کو مخالفت حق کی کدورت اور سیاہی سے پاک وصاف کر دینے کا نام تصوف ہے۔
(کشف المحجوب)	

اگرچہ تصوف کا مادہ اشتقاق "صفا" بھی ہے لیکن لغوی اعتبار سے یہ اشتقاق اپنے اندر کئی اور احتمالات بھی رکھتا ہے۔

قول ثانی "الصفو"

تصوف کا دوسرا مادۂ اشتقاق "الصفو" بیان کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی "محبت اور دوستی میں اخلاص" کے ہیں۔ جیساکہ صاحب المنجد اس مادہ کی نسبت رقم طراز ہیں:

الصفو ھو الاخلاص فی المودۃ الصفی ھو الصدیق المخلص	"الصفو" کے معنی محبت میں اخلاص کے ہیں اور صفی سے مراد مخلص دوست ہوتا ہے۔
(المنجد تحت مادہ صفو)	

اس مادہ کے اعتبار سے صوفی سے مراد وہ شخص ہے جس نے دنیا و آخرت کے اجروجزا سے بے نیاز ہو کر محبوب حقیقی سے بے لوث محبت اور دوستی کا رشتہ استوار کر لیا ہو اور جس کی تمام تر مساعی کا محرک فقط رضائے الٰہی کی طلب ہو۔

قول ثالث "الصوف"

تصوف کے باب میں تیسرا قول اس کے "الصوف" سے مشتق ہونے کا ہے جس کے معنی "اون" کے ہیں۔ باب تفعل کے وزن پر تصوف کا معنی ہے۔ اس نے اونی لباس پہنا۔

امام ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں:

تصوف اذا لبس الصوف کما یقال	تصوف (اس وقت کہا جائے) جب کسی

تقمص اذا لبس القميص
(الرسالۃ القشیریہ: ۱۲۶)

نے صوف کا لباس پہنا جیسے کسی کے قمیص پہننے پر تقمص بولا جاتا ہے۔

بعض مردان حق نے قرون اولی میں اظہار تذلل، مجاہدہ اور غایت عجز و نیاز کی خاطر کھردرا اونی لباس پہنا چنانچہ اس اونی لباس کی مناسبت سے ان کو صوفی کا لقب ملا۔ شیخ عیاض الدینؒ فرماتے ہیں۔

چوں در زمان سابق صاحبان صفات مذکورہ "صوف" می پوشیدند لہذا مجازا اعمال وافعال ایشاں را "تصوف" نامیدند
(غیاث اللغات: ۱۱۳)

چونکہ گزشتہ زمانے (قرون اولی) میں مردان حق (تذلل اور غایت عجز وانکساری کے باعث) اونی لباس پہننے لگے تھے اس لئے (اس مناسبت سے) ان کے اعمال وافعال کو "تصوف" کا نام دے دیا گیا۔

علامہ ابن خلدون اسی موقف کی تائید ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

ان التصوف مشتقۃ من الصوف لاختصاص اصحابها بلبس الصوف وقیل ان النسبته للصوف علی اعتبار ان لباسه کان یغلب علی المتقدمین من السلف لانه اقرب الی لتواضع والذهد و لکونه لباس الانبیاء (الشیخ ارسلان الدمشقی: ۴۰)

تصوف صوف سے مشتق ہے کیونکہ اونی لباس اہل تصوف سے مختص تھا۔ کہا گیا ہے کہ اون کی طرف نسبت اس اعتبار سے ہے کہ یہ لباس اسلاف متقدمین کو زیادہ مرغوب تھا کیونکہ یہ زہد وتواضع کے قریب تر ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ انبیاء کا لباس بھی رہا ہے۔

قول رابع "الصوف"

الصوف سے اشتقاق کے حوالہ سے ایک معنی "یکسو شدن" بھی بیان کیا گیا ہے یعنی کسی طرف سے پوری یکسوئی سے متوجہ ہو جانا۔ اس اعتبار سے تصوف کا مقصود ومطلوب ذات الٰہی کے ذکر ومحبت میں اسقدر یکسوئی اور محویت حاصل کرنا ہے کہ ماسوٰی

اللہ کی طلب و خواہش سے دھیان[۱] بالکل ہٹ جائے۔

علامہ غیاث الدینؒ فرماتے ہیں۔

می تواند کہ تصوف ماخوذ باشد از صوف کہ بمعنی یکسو شدن و رد گردانیدن است چوں واصلان حق از ماسوی اللہ یکسوی شدند و ردگردانند لہٰذا کار ایشاں را تصوف نامیدند

(غیاث اللغات: ۱۱۳)

ہو سکتا ہے کہ تصوف صوف سے مشتق ہو جس کا معنی ہے یکسو ہو جانا اور (ہر طرف سے) منہ پھیر لینا چونکہ اللہ سے وصل کرنے والے (ہر طرف سے کٹ کر) صرف اسی سے واصل ہوتے ہیں اور ماسویٰ اللہ سے روگردانی کرتے ہیں اس لئے ان کے احوال کو تصوف کہا جاتا ہے۔

قول خامس "الصفہ"

بعض علماء نے تصوف کا اشتقاق صفہ سے بھی کیا ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ ابوبکر بن اسحاق بخاریؒ فرماتے ہیں۔

قال قوم انما سموا صوفیۃ لقرب اوصافھم من اوصاف اھل الصفۃ الذین کانوا فی عھد رسول اللہ

(ایقاظ الھمم فی شرح الحکم، ۱:۶)

ایک گروہ کا کہنا ہے صوفیہ کی وجہ تسمیہ ان کا باعتبار اوصاف اصحاب صفہ سے قریب تر ہونا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں موجود تھے۔

اسی قول کی تائید میں شیخ احمد الحسینیؒ فرماتے ہیں:

انہ من الصفۃ اذ جملہ اتصاف

یہ صفہ سے ماخوذ ہے کیونکہ تصوف تمام

۱۔ اس معنی کی تائید سورہ المزمل کی وہ آیت بھی کرتی ہے جس میں اللہ سبحانہ اپنے رسول ﷺ سے پیار بھرے انداز میں مخاطب ہیں۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل، ۷۳:۸)

(اے محبوب! اپنے رب کے اسم کا ورد کرو اور ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی کے ہو جاؤ)

بالمحامد و ترک الاوصاف المذمومۃ (شرح التصرف لمذاہب التصوف:۲۱)

تر خوبیوں سے متصف ہونے اور اوصاف مذمومہ کے ترک کر دینے پر مبنی ہے۔

قول سادس "الصف"

بعض علماء تصوف کو "الصف" سے مشتق قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں امام ابو القاسم القشیری" فرماتے ہیں۔

انہ مشتق من الصف فکانہا فی الصف الاول بقلوبھم من حیث المحاضرۃ من اللہ تعالی (الرسالۃ القشیریہ:۱۲۶)

تصوف صف سے مشتق ہے گویا کہ صوفیہ کے قلوب باری تعالیٰ کی حضوری کے اعتبار سے صف اول میں ہوتے ہیں۔

تصوف کے لغوی پہلوؤں میں مشترک نکتہ

لغوی اعتبار سے تصوف کے جتنے معانی و مطالب اوپر بیان کئے گئے ہیں ان سب میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ تصوف اللہ رب العزت سے ایسی بے لوث اور بے غرض دوستی اور محبت کا نام ہے جو نہ صرف دنیوی لالچ بلکہ اخروی طمع سے بھی یکسر پاک ہو اور اس راہ کے سالک کا قلب تعلق باللہ میں ہمہ نوع دنیوی و اخروی منفعتوں مصلحتوں اور ہر قسم کے اندیشہ و خطرے سے کلیتاً بے گانہ ہو جائے جس کے نتیجے میں اخلاص فی النیتہ والعمل (نیت و عمل کے اخلاص) کا جذبہ ظاہر و باطن میں اس قدر راسخ ہو جائے کہ انسان کی بندگی خالصتاً لوجہ اللہ ہو جائے نہ دنیا و آخرت میں انعام وجزا کی آرزو بندے کی عبادت کا محرک رہے اور نہ سزا و عتاب کا خوف بقول شخصے۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

الغرض تعلق باللہ کی لذت، وحلاوت اور محبت الٰہی کی چاشنی وشیرینی کو اس

طرح حرز جان بنالیا جائے کہ بارگاہ صمدیت میں حاضری کے وقت اس کے غیر کا موہوم سا خیال بھی بندے کو دل کے کسی گوشے میں راہ نہ پاسکے اور پھر اسی طرح اسے ہمہ وقتی بندگی نصیب ہو جائے۔ بس یہی حقیقت تصوف ہے۔

حقیقت تصوف: مختلف مادہ ہائے اشتقاق کے حوالے سے

(۱) الصفاء:

اگر تصوف کو "صفا" سے مشتق مانا جائے تو اس سے وہ طریق زندگی مراد ہے۔ جس کو اپنا کر قلب انسانی معصیت کی سیاہی اور اثم وعدوان کی آلودگیوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ آئینہ دل صاف وشفاف ہو کر فسق وفجور کے زنگ دور ہو جاتے ہیں۔ باطن سے غفلتوں اور نافرمانیوں کی ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں اور نتیجۃً قلب صیقل ہو کر مہبط انوار الٰہی بن جاتا ہے۔

دل کی سیاہی اور آلودگی کا ذکر قرآن حکیم یوں کرتا ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

(المطففین، ۸۳: ۱۴)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ (اصل وجہ ان کی تکذیب کی یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان کے اعمال (بد) کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

والرین الغلبة یقال ران الخمر علی قلبه واذا غلب علیه سکره والمعنی غلب علی قلوبهم ظلمت ما کانوا یکسبون من المعاصی حتی عمی قلوبهم عن التمیز بین الحق والباطل

(التفسیر المظهری، ۱۰: ۲۲۲)

"رین" کا معنی ہے غلبہ (جیسے) کہا جاتا ہے شراب اس کے دل پر غالب ہو گئی جب شراب غالب آجائے اور نشہ میں غرق کر دے تو معنی یہ ہوا کہ ان کے افعال بد کی وجہ سے ان کے دلوں پر تاریکیاں چھاگئیں حتی کہ ان کے دل حق وباطل کے مابین تمیز سے عاری ہو گئے۔

حضور ختمی مرتبت ﷺ کا ارشاد ہے کہ

المومن اذا اذنب کانت نکتۃ سوداء فی قلبہ فان تاب و نزع واستغفر صقل قلبہ منھا وان زادت حتی تعلو قلبہ فذالک الران الذی ذکر اللہ فی کتابہ کلا بل ران علی قلوبھم ما کانو یکسبون

(رواہ البغوی و کذا الخرج احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم التفسیر المظھری الجزء العاشر: ۲۲۲)

جب کوئی مومن گناہ کا مرتکب ہو تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ مرتسم ہو جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کر لے گریہ وزاری کرے، اور معافی مانگے تو اس کا دل اس سیاہی سے صیقل ہو جاتا ہے اور اگر وہ معصیت میں زیادتی کرے تو اس پر اس سیاہی کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یہی وہ زنگ اور سیاہی ہے جس کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں اس طرح کیا کہ ہرگز ایسا نہیں بلکہ (اصل وجہ ان کی تکذیب کی یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

ارشاد گرامی کا مفہوم یہ ہے کہ مسلسل گناہ اور معصیت کیشی سے انسان کے دل پر ایک سیاہ نقطہ مرتسم ہو جاتا ہے اگر وہ معصیت سے باز نہ آئے اور برابر گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے تو اس کے لوح قلب پر سیاہی پھیلتے پھیلتے مکمل طور پر محیط ہو جاتی ہے جس کے باعث اس کا دل ظلمت کدہ بن جاتا ہے اس مرحلے پر فسق وفجور میں مبتلا رہنے والا شخص اپنی خطاؤں اور سیاہ کاریوں پر احساس ندامت سے بھی عاری ہو جاتا ہے اور اس کے قلب وضمیر پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص نیکی وبھلائی کا کام کرتا ہے اس کے دل پر نور کا ایک نقطہ نقش ہو جاتا ہے اور مسلسل نیکیاں کرنے کے باعث وہ نور پھیلتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا دل مصدر انوار بن جاتا ہے جو نہ صرف اس کی اپنی اقلیم بدن کو منور کر دیتا ہے بلکہ جو کوئی بھی صفائے قلب کے ساتھ اس کی معیت میں آجاتا ہے منور ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو خود

شعوری کی دولت سے بہرہ ور ہیں جنہیں دل کی ظلمت اور باطن کی سیاہی سے آگاہی میسر ہے اور وہ ہر لمحہ توبہ کے نور سے لوحِ دل کی تاریکیاں اجالوں میں بدلتے رہتے ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کا فضل و کرم شامل ہوئے بغیر ممکن نہیں۔

پس صوفی وہ شخص ہے جس نے اپنے قلب و باطن کو گناہوں کی آلودگیوں سے پاک اور نفس کو رذائل اخلاق کی تاریکیوں سے منزہ کر لیا ہو اور اس کے آئینہ دل پر معصیت کی پرچھائیاں بھی باقی نہ رہی ہوں تزکیہ و تصفیہ باطن کی راہ کو تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جب صفا کا یہ معیار نصیب ہو جائے تو انسان قلب و باطن ان کیفیات سے لذت آشنا ہو جاتا ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

ان الصفا صفة الصدیق ان اردت صوفیا علی التحقیق	یاد رکھ کہ صفا درحقیقت صدیق کی صفت ہے اگر تو از روئے حقیقت صوفی بننا چاہتا ہے

تو اس مفہوم کو پیش نظر رکھ اور صاحبان صدق کی اتباع کر یہی وہ جادۂ عشق ہے جس پر چل کر محبوب حقیقی سے سچی محبت اور دوستی کا لازوال رشتہ استوار ہوتا ہے جس کے بعد محبوب کی رضاجوئی اور خوشنودی کے سوا کسی غیر کی طلب' مادی منفعت یا ہوائے نفس کے خیال تک سے دل آلودہ نہیں ہوتا اور نتیجتاً بندے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہتا۔

۲۔ الصفو:

اس مادے کے اعتبار سے تصوف سے مراد تعلق باللہ میں کمال درجہ اخلاص اور غایت درجہ صدق و بے نفسی ہے اور صوفی سے مراد وہ شخص ہے جس نے دنیا و آخرت کے اجر و جزا سے بے نیاز ہو کر محبوب حقیقی سے بے لوث محبت اور دوستی کا رشتہ استوار کر لیا ہو اور جس کی تمام تر مساعی اور مجاہدہ و مشقت کا محرک صرف اور صرف جذبہ رضائے الٰہی ہو اور اسے اخلاص تامہ کا وہ مقام نصیب ہو چکا ہو کہ کسی بھی

دنیوی واخروی نعمت کی حیثیت اس کی نگاہ میں پر کاہ سے بھی زیادہ نہ رہے۔

۳۔ الصوف:

اگر تصوف کو صوف سے مانا جائے تو لغوی اعتبار سے تصوف کا معنی اونی لباس پہننا اور صوفی سے مراد اونی لباس پہننے والا ہو گا۔ اونی کھردرا لباس پہننا دنیوی لذتوں اور جسمانی راحتوں سے کنارہ کشی کی علامت ہے اور اللہ کی بارگاہ میں غایت درجہ تواضع، انکساری خشوع و خضوع، عجز و نیاز مندی اور تذلل کی دلیل ہے۔ اونی لباس پہننا سنت انبیاء ہے جو خود نبی اکرم ﷺ سے بھی ثابت ہے جیسا کہ مذکور ہے۔

عن انس بن مالک قال کان رسول اللہ ﷺ یجیب دعوۃ العبد و یرکب الحمار و یلبس الصوف

(عوارف المعارف: ۲۰۰)

انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غلام کی دعوت قبول فرما لیتے گدھے پر سواری فرما لیتے اور صوف زیب تن فرمایا کرتے تھے۔

اکثر انبیاء علیہم السلام صوف کا لباس پہنتے تھے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لباسی الصوف و شعاری الخوف

(نشأۃ التصوف الاسلامی)

میرا لباس صوف اور شعار خوف ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے صوف پہننے کے باب میں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ۔

مر بالصخرۃ من الروحاء سبعون نبیا حفاۃ علیھم العباء یؤمون البیت الحرام

(عوارف المعارف (مترجم) باب۔ ۶: ۲۰۰)

"روحاء" چٹان کے پاس سے ستر انبیاء گزرے جن کے اوپر (اونی) چادریں تھیں پاؤں ننگے تھے اور بیت الحرام کی طرف جا رہے تھے۔

عوارف المعارف میں نبی اکرم ﷺ کا یہ قول مذکور ہے کہ جب موسیٰ علیہ

السلام اللہ سبحانہ سے ہم کلام ہوتے تو لباس صوف میں مبعوث ہوتے تھے۔

قال رسول اللہ ﷺ یوم کلم اللہ تعالٰی موسی علیہ السلام کان علیہ جبۃ صوف و کمۃ من صوف نعلاہ من جلد حمار غیر مزکی

(عوارف المعارف: ۲۰۲)

فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جس دن موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سبحانہ سے کلام کیا آپ کے بدن پر صوف کا جبہ صوف کا تہ[illegible]صوف کی چادر اور صوف کی ہی آستین تھی آپ کے نعلین مبارک گدھے کی بے رنگی کھال کے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔

لقد ادرکت سبعین بدریا کان لباسھم الصوف

(نشأۃ التصوف: ۱۱) (عوارف المعارف: ۲۰۰)

میں نے ستر بدری صحابہ کو دیکھا کہ ان کا لباس صوف کا تھا (صوف کا لباس پہنے ہوئے تھے)

حضرت ابو ہریرہؓ اور فضالہ بن عبیدؓ کی روایت ہے کہ یہ بدری صحابہ فقر و فاقہ کے ہاتھوں اس قدر کمزور تھے کہ

کانوا یخرون من الجوع حتی یحسبھم الأعراب مجانین و کان لباسھم الصوف حتی ان بعضھم کان یعرق فی ثوبہ فیوجد منہ رائحۃ الضان اذا اصابہ الغیث

(عوارف المعارف: ۲۰۰)

وہ بھوک سے نڈھال ہو کر گر پڑتے تھے حتی کہ اہل عرب انہیں پگلے سمجھنے لگے ان کا لباس صوف کا تھا حتی کہ بعض اپنے لباس میں پسینے سے شرابور ہو جاتے اور جب بارش پڑتی تو ان میں بھیڑ کی اون کی بو پائی جاتی تھی۔

حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ

یاکل الخبز والزیتون و یلبس الصوف

(نشأۃ التصوف)

زیتون کے تیل کے ساتھ روٹی کھا لیتے اور صوف کا لباس پہنتے۔

چنانچہ یہی وہ لباس تھا جسے تابعین اور تبع تابعین کے دور میں نیک نہاد بندگان

حق نے سنت انبیاء و صحابہ کی پیروی میں از رہ عجز و تواضع اور انکسار و تذلل اپنایا اور اسی لباس کی نسبت سے انہیں صوفیا کہا جانے لگا اور اس طریقۂ زندگی کو جو محبوب حقیقی کے ساتھ سچی لو لگا کر اس کی محبت میں فنا ہو جانے سے تشکیل پایا تصوف کا نام دیا جانے لگا۔ گویا لذات جسمانی سے کنارہ کشی اور علائق دنیوی سے دستبرداری کے ساتھ ساتھ محبوب حقیقی کی بارگاہ میں ظاہراً و باطناً عجز و انکساری اور تواضع و تذلل سے عبارت طرز زندگی کو تصوف کا نام دیا گیا۔

صوفیاءؒ نے اپنا تشخص ظاہری لباس کے حوالے سے قائم کیوں کیا؟

تصوف سراسر باطنی احوال اور روحانی کمالات سے عبارت ہے اور لفظ تصوف کے دیگر تمام مادہ ہائے اشتقاق انہی احوال و کمالات اور باطنی کیفیات پر دلالت کرتے ہیں لیکن یہ روحانی احوال اور کیفیات و کمالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے بلکہ مسلسل تغیر پذیر رہتے ہیں۔ [۱]

اس لئے صوفیا نے اپنا تشخص ایسے اسم کے حوالے سے قائم کرنا پسند نہ کیا جس کا مسمی وہ گوناگوں کیفیات و کمالات ہیں جو ہر آن بدلتے رہتے ہیں بلکہ اپنے تشخص کی بنیاد اپنے مستقل معمول یعنی اونی لباس کو بنایا۔

مزید برآں صوفیا نے اپنا تشخص اپنے روحانی احوال اور باطنی کیفیات کے حوالے سے قائم کرنا اس لئے بھی پسند نہ کیا کہ ان کے باطنی احوال و کیفیات کو چھپانا اپنا مقصود سمجھتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ تو اپنے باطنی احوال کسی پر منکشف نہ ہوں چنانچہ انہوں نے اپنا تشخص ایسے لفظ سے قائم کرنا پسند کیا جو ان کے ظاہری لباس سے متعلق و منسوب تھا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے اپنی ظاہری علامت کو اپنے تشخص کی بنیاد قرار دیا اور ظاہری اعتبار سے اپنے تشخص پر دلالت کرنے والے لفظ پر اپنے

۱۔ انہی احوال و کیفیات پر دلالت کرنے والا ایک اسم صوفیاء کے ہاں ابدال استعمال ہوتا ہے جو صوفیاء کے ہر آن تغیر پذیر احوال و کیفیات پر دلالت کرتا ہے۔

باطنی احوال اور روحانی کیفیات کی پرچھائیاں تک نہ پڑنے دیں یہ ان کے کمال درجہ اخلاص اور صدق وصفا کی ایسی لطیف دلیل ہے جس کا اندازہ کوئی صاحبِ ذوق لطیف ہی کر سکتا ہے۔

۴۔ الصوف

تصوف کو چوتھے مادہ اشتقاق "الصوف" سے مشتق مانا جائے تو لوح ذہن پر محبوب حقیقی سے محبت میں کامل یکسوئی اور انہماک واستغراق کا تصور ابھرتا ہے اس مادہ اشتقاق کے اعتبار سے صوفیاء وہ خوش نصیب لوگ ہیں جن کو حضور حق سے یکسوئی کی دولت عطا کر دی گئی ہو اور جو ہمہ وقت اپنے رب سے عشق و شیفتگی کی کیفیت جذب میں مخمور رہے ہوں جن کے لوح قلب سے ہر غیر کا نقش مٹ چکا ہو اور جن کے نہاں خانہ دل میں سوائے محبوب حقیقی کے کسی غیر کے تصور تک کا گزر محال ہو۔

غور کیا جائے تو تصوف حقیقت انسانی کی تکمیل اور امتیاز انسانیت کا مقام رفیع ہے۔

تصوف اور انسان کی حقیقت----ایک لطیف نکتہ

ماہرین لغت میں سے بعض کے نزدیک انسان انس سے مشتق ہے یعنی وہ ہستی جسے کسی سے انس ہو جائے جبکہ بعض نے لفظ انسان کا مادہ نسی بھی بیان کیا ہے اسی سے نسیان یعنی بھول ۔ہے اسی لئے کہا جاتا ہے **الانسان مرکب من الخطاء والنسیان** انسان خطا اور نسیان سے مرکب ہے اس بنا پر بھول چوک اور خطا کا عنصر انسان کی سرشت اور خمیر میں شامل ہے۔

درحقیقت اپنی خلقت کے اعتبار سے انسان پر ان دونوں معنوں کا اطلاق ہوتا ہے یعنی انسان "انس اور نسیان" دونوں ہی سے عبارت ہے۔ انس کے درجہ کمال تک پہنچنے کا لازمی نتیجہ نسیان ہے یعنی انسان جب کسی سے مانوس ہو جاتا ہے تو یہ انس رفتہ رفتہ محبت و شیفتگی کا روپ دھار لیتا ہے اور اس کے خانہ دل میں ہمہ وقت یاد محبوب ہی

گھر کئے رہتی ہے۔ پھر محبت کی بڑھتی ہوئی شدت جب انہماک اور استغراق کے مراحل سے گزرتی ہے تو محب فنائی المحبوب ہو جاتا ہے اس مقام پر غیر کا نقش اس کی لوح دل سے محو ہو جاتا ہے اور وہ اپنے محبوب کی یاد میں اس طرح سرشار وخود فراموش رہنے لگتا ہے کہ اسے ہر سو سوائے محبوب کے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ گویا اس کی نظر میں محبوب کا غیر کلیتاً معدوم اور کالعدم ہو جاتا ہے۔ تصوف انسان کو فنائی اللہ کی اسی منزل سے ہمکنار کر دینے کا نام ہے غور کیا جائے تو تصوف حقیقت انسانی کے حوالے سے جوہر انسانیت کی تکمیل اور امتیاز انسانیت کا نقطۂ کمال ہے۔

ایک ضروری وضاحت

یہاں ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا مکمل انسان صرف وہی ہے جو محبوب حقیقی سے غایت درجہ مانوس اور غیر اللہ سے یکسر دست کش ہو جائے اور ہمہ وقت اسی کے ذکر و فکر میں یوں مگن رہنے لگے کہ بیوی بچوں کے حقوق اور دیگر معاشرتی وسماجی ذمہ داریوں سے کلیتاً دستبردار ہو جائے۔ نہیں نہیں! ایسا تصور تعلیمات اسلامی سے بے بہرہ ہونے کی دلیل ہے۔ اسلام میں انسان کامل سے مراد وہ انسان ہے جو محبوب حقیقی کی یاد میں رہتے ہوئے بھی اس کی مخلوق سے اپنا علاقہ و تعلق برقرار رکھے اور اس کے ساتھ تعلقات میں اپنے محبوب ہی کی پسند وناپسند اور امرونہی کا خیال رکھے اور زندگی کے تمام امور ومعاملات میں اس کے ہر حکم کو بہ دل وجان بجا لائے۔ یعنی نہ محبوب کو بھولے نہ اس کے حکم کو اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایسے دعوائے محبت کو سوائے دجل وفریب اور منافقت کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ دنیا میں رہتے ہوئے معاملات دنیوی میں اوامر ونواہی کی بالالتزام پابندی آز روئے شریعت، محبوب حقیقی کی محبت کا اولین تقاضا اور تصوف کا نصب العین ہے گویا تصوف سے مراد وہ طریق زندگی ہے جس میں انسان اللہ کی محبت میں اس قدر منہمک اور فنا ہو جائے کہ اس کے حکم کی سرتابی کا کوئی خیال بھولے سے بھی اس کے دل میں نہ آئے اور اضطراری یا غیر ارادی طور پر بھی اس کا قدم جادۂ محبت واطاعت سے ہٹنے نہ پائے۔

۵۔ صفہ:

تصوف کو اگر صفہ سے مشتق مانا جائے تو شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور دیگر علماء و مؤرخین کے مطابق اس کا رشتہ اصحاب صفہ سے جا ملتا ہے جو مربی کائنات رحمت عالم ﷺ سے براہ راست تربیت یافتہ جماعت تھی جن کی تعداد چار سو تک بیان کی جاتی ہے۔ یہ لوگ گھربار اور بیوی بچوں کے جھنجٹ سے آزاد تھے اور شب و روز بارگاہ مصطفوی سے روحانی تربیت حاصل کرنے کے لئے مسجد نبوی کے قریب ایک چبوترے پر قیام پذیر رہتے تھے۔ چونکہ چبوترے کو عربی زبان میں صفہ کہا جاتا ہے اس لئے اس چبوترے پر قیام کرنے والے اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

اصحاب صفہ گو اہل و عیال اور حصول معاش جیسی ذمہ داریاں سے آزاد تھے لیکن وہ تارک الدنیا ہرگز نہ تھے رحمت عالم ﷺ کے حکم سے وہ مختلف النوع ذمہ داریاں ادا کرتے اور محنت و مشقت کے متعدد کام کرتے غزوات میں جہاد کے لئے حضور ﷺ کے دیگر صحابہ کے ساتھ شانہ بشانہ شریک ہوتے فراغت کے اوقات مسجد نبوی میں گزارتے اور حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ظاہری تربیت، روحانی فیض اور باطنی توجہات سے متمتع ہو کر تزکیہ نفس تصفیہ باطن اور روحانی بالیدگی کا سامان حاصل کرتے۔ حضور ﷺ کی نگاہ کرامت اثر اور باطنی توجہات کے فیضان نے انہیں باطنی کمالات کو رفیع الشان منازل پر فائز کر دیا تھا۔ ان اصحاب صفہ کے فقروفاقہ اور مجاہدہ نفس کا یہ عالم تھا کہ مسلسل روزے رکھتے اور کئی کئی دن صرف کھجوریں کھا کر گزار کرتے بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو جاتے لیکن صبرو شکیبائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پاتا۔ حضور اکرم ﷺ کی حیات مقدسہ پر اختیاری فقر کا جو رنگ غالب تھا اصحاب صفہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ حضرت ابو ہریرۃ فرماتے ہیں کہ:۔

لقد رایت سبعین من اهل الصفه يصلون فی ثوب واحد، منهم من لايبلغ رکبتيه، فاذا رکع احدهم قبض بيديه ان تبدو عورته وقال	میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ وہ ایک ہی قسم کے لباس میں نماز پڑھتے کسی کا لباس ان کے گھٹنوں تک نہ پہنچتا اور جب وہ رکوع کرتا تو اپنے لباس کو

بعض اهل الصفه جئنا جماعة الٰی رسول اللّٰہ ﷺ و قلنا یا رسول اللّٰہ احرق بطوننا التمر فسمع بذلک رسول اللّٰہ ﷺ فصعد المنبر ثم قال ما بال اقوام یقولون احرق بطوننا التمر اما علمتم ان ھذا التمر ھو طعام اهل المدینۃ و قد واسونا بہ و واسیناکم مما و اسونا بہ والذی نفس محمد بیدہ ان منذ شهرین لم یرتفع من بیت رسول اللّٰہ ﷺ دخان للخبز ولیس لهم الا الاسودان الماء والتمر

(عوارف المعارف (مترجم)؛ ۲۰۳، ۲۰۴)

مضبوطی سے پکڑ لیتا مبادا کہ اس کی شرمگاہ ننگی ہو جائے اور بعض اہل صفہ کا قول ہے کہ ہم گروہ کی صورت میں بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کھجور نے ہمارے پیٹوں میں سوزش پیدا کر دی۔ آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا کیا حال ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ کھجور نے ہمارے پیٹ جلا دیئے ہیں کیا تم جانتے نہیں کہ یہی کھجور ہے جو کہ کھانا ہے اہل مدینہ کا اور اسی کے ساتھ انہوں نے ہماری غمخواری کی اور اسی کے ساتھ ہم نے تمہاری غمخواری کی اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ دو ماہ تک اللہ کے رسول ﷺ کے گھر سے دھواں نہیں اٹھا اور ان کے لئے سوائے دو سیاہ چیزوں پانی اور کھجور کے کچھ نہیں۔ (یہ بات تعلیم کے لئے کہی)

نبی اکرم ﷺ نے بر بنائے مصلحت یہ بات ظاہر فرما دی تاکہ ہر کوئی جان لے۔ اگر تربیت پانے والے مشقت کے جاں گسل مرحلوں سے گزر رہے ہیں تو تربیت دینے والا بھی ان سے بدرجہا زیادہ سخت کیفیتوں سے گزرتا ہے

اصحاب صفہ کو فاقہ کے باعث جو قابل رشک مقام بارگاہ الٰہیہ میں حاصل

ہوا اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت دلالت کرتی ہے۔

وقف رسول اللہ ﷺ یوما علی اہل الصفۃ فرای فقرھم و جھدھم و طیب قلوبھم فقال ابشروا یا اصحاب الصفۃ فمن بقی منکم علی النعت الذی انتم علیہ الیوم راضیا بما ھو فیہ فانہ من رفقائی یوم القیامۃ

(عوارف المعارف، مترجم: ۲۰۴)

ایک روز رسول اللہ ﷺ اہل صفہ کے درمیان کھڑے ہوئے اور ان کے فقر، جان کنی اور سرور قلب کو دیکھا فرمایا اے اصحاب صفہ! خوش ہو جاؤ کہ جو تم میں سے موجود صفات پر قائم رہا اور اسی حال پر راضی رہا وہ یوم قیامت میرے رفقاء میں سے ہو گا۔

قرآن حکیم میں ان نفوس قدسیہ کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ

(البقرہ، ۲: ۲۷۳)

(اور جو خرچ کرتا ہے) ان فقراء پر جو اللہ کی راہ میں اس قدر مصروف ہیں کہ زمین میں معاشی جدوجہد کی استطاعت (فرصت) بھی نہیں رکھتے۔

یہ وہ اصحاب صفہ تھے جن کے قلب وباطن **و یزکیھم** کے کاملاً مصداق بن کر مشاغل حیات اور علائق دنیوی سے کٹ کر کمال درجہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی محبت میں مستغرق ہو گئے تھے چنانچہ وہ بندگان خدا جنھوں نے ان نفوس قدسیہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لذات دنیوی سے کنارہ کش ہو کر محبوب حقیقی کی رضا ہی کو اپنا مقصود ومطلوب ٹھہرا کر اسی کے مکھڑے کے طلب گار بن گئے صوفیا کہلائے اور ان کا طریق زندگی تصوف کے نام سے موسوم ہوا۔

۶۔ الصف

تصوف کو اگر الصف سے مشتق قرار دیا جائے تو تصوف کی راہ کے سالک وہ صوفیا اور سعادت نصیب نفوس مراد ہوں گے جن کے دل بارگاہ ایزدی میں صف اول میں حاضر ہیں یہی وہ پاک نہاد اور روشن ضمیر لوگ ہیں جن کے دل دنیا ومافیہا کی محبت

سے بے نیاز ہیں اور ان کا رشتہ علائقِ دنیوی سے اس حد تک منقطع ہو چکا ہے کہ وہ مدام اپنے رب کے حضور دیدار محبوب کے طالب رہتے ہیں اس اعتبار سے خشوع وخضوع کے ساتھ کیفیات عشق و محبت کا لطف اٹھاتے ہوئے دیدار محبوب کے طالب رہتے ہیں اس اعتبار سے بندے کا ہوا وہوس اور علائق دنیوی کی صفیں چیرتے ہوئے حضور صمدیت میں پہلی صف میں حاضر ہو جانے کا نام تصوف ہے۔

تصوف۔ سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کے نکات عجیبہ

آپؒ حروف تصوف کے حوالے سے تصوف کی حقیقت کو یوں عیاں کرتے ہیں۔

ولم يسموا اهل التصوف الا لتصفية باطنهم بنور المعرفة والتوحيد اولانهم انتسبوا الاصحاب الصفة او للبسهم الصوف للمبتدی صوف الغنم و للمتوسط صوف المعز و لمنتهی صوف المرعز و هو صوف المرقع و كذا حالاتهم فی الباطن علی حسب مراتب احوالهم و كذا بالاطعمة والمطعم والمشرب قال صاحب التفسير المجمع يليق باهل الزهد كل خشن من الملبس والمطعم والمشرب و باهل المعرفة كل لين منها فان انزال الناس منازلهم من السنة لی لاتتعدی احد طوره لانهم فی الصف الاول فی الحضرة الاحديه فلفظ التصوف

صوفیائے کرام کا اہل تصوف کے نام سے موسوم ہونا ان وجوہات کی بنا پر نور معرفت اور توحید کے ذریعے اپنے باطن کو جملہ آلائشوں سے پاک صاف کرنے کی بنا پر ہے یا اس لئے کہ اصحاب صفہ کی طرف منسوب ہیں یا صوف (اون) پہننے کے اعتبار سے (کیونکہ سلسلہ تصوف میں) مبتدی (جو تصوف کے ابتدائی مراحل میں ہو) بکری کا کھردرا صوف (لباس) پہنتے ہیں متوسط (اوسط درجے کا صوفی) بکری کا صوف جو نہ زیادہ نرم ہو نہ زیادہ سخت اور منتہی (کامل جو تصوف کے مدارج طے کر چکا ہو) نرم اون کا لباس یعنی صوف مرقع (صوف کا لباس جس میں پیوند لگے ہوں) اور اسی طرح باطن میں بھی ان کے احوال ان کے

اربعۃ احرف تاءٌ۔ و صادٌ۔ و واوٌ۔ و فاءٌ

مراتب کے حسب حال ہوتے ہیں اور ان کا کھانا پینا بھی ان کے حالات اور مراتب کے مطابق ہوتا ہے۔ صاحب تفسیر مجمع نے لکھا ہے اہل زہد کو چاہئے کہ وہ کھردرا لباس پہنیں اور چھوٹا موٹا کھائیں۔ اہل معرفت بہتر لباس پہنیں اور بہتر کھانا کھائیں لوگوں کا اپنی منازل میں اپنے حسب حال رہنا سہنا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہے۔ (تاکہ کوئی اپنی حد سے تجاوز نہ کرے) کیونکہ وہ (یعنی اہل معرفت) بارگاہ ایزدی میں اعلیٰ مراتب والوں میں سے ہیں لفظ تصوف چار حروف پر مشتمل ہے۔

فالتاء:

من التوبۃ وھو علی وجھین توبۃ الظاہر و توبۃ الباطن فتوبۃ الظاھریۃ فھی ان یرجع بجمیع اعضائہ الظاھریۃ من الذنوب الذمائم الی الطاعات و من المخالفات الی الموافقات قولا و فعلا و اما التوبۃ الباطنیۃ فھی ان یرجع الی الموافقات بتصفیۃ القلب فاذا حصل تبدیل الذمیمۃ بالحمیدۃ فقد تم مقام

(ت) سے مراد توبہ ہے اور وہ دو طرح کی ہے توبہ ظاہری اور توبہ باطنی۔ توبہ ظاہری یہ ہے کہ انسان قولاً و فعلاً اپنے تمام اعضائے ظاہری کو گناہوں اور برائیوں سے ہٹا کر اطاعت کی راہ اختیار کرے نیز خلاف شریعت اعمال سے توبہ کرکے اس کے احکام کے مطابق عمل کرے توبہ باطنی یہ ہے کہ انسان دل کو آلائشوں سے پاک رکھے اور شریعت

التاء

کے موافق اعمال صالحہ کی طرف رجوع کرے پھر جب برائی نیکی سے بدل جائے تو "ت" کا مقام مکمل ہو گیا (یعنی اس کو کامل توبہ نصیب ہو گئی)

والصاد:۔

من الصفا وهو ایضا علی وجهین صفاء القلب وصفاء السر فصفاء القلب ان یصفی قلبه من الکدورات البشریة مثل العلائق التی تحصل فی القلب من کثرة الاکل الشرب والمنام والکلام والملاحظات الدنیویة مثل حب زیادة الکسب و زیادة الجماع و زیادة محبة اولاده و اهله و نحو ذالک و تصفیة القلب من هذه الخصال المذکورة لایحصل الا ملازمة ذکر الله تعالی فی التلقین جهرا فی الابتداء الی ان یبلغ مقام الخفیه کما قال الله تعالی انما المومنون الذین اذا ذکر الله وجلت قلوبهم ای خشیت والخشیة لاتکون الا بعد انتباه القلب من کرم الغفلة و تصقیله فینقش فیه صورة الغیب من الخیر والشر کما قال علیه

ص سے مراد صفائی ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں ا۔ قلب کی صفائی ۲۔ مقام سر کی صفائی قلب کی صفائی یہ ہے کہ دل ان بشری کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو جائے جو عموماً دل کے اندر پائی جاتی ہیں مثلاً بکثرت کھانے پینے' سونے اور گفتگو کرنے کی خواہشات' دنیوی رغبتیں مثلاً زیادہ کسب اور کثرت جماع اور اپنے اہل وعیال کی حد سے زیادہ محبت وغیرہ ان مذکورہ عادات ذمیمہ سے دل کو پاک وصاف کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ابتدا میں شیخ کامل کی تلقین سے ذکر الٰہی بالجہر اور بالالتزام کیا جائے حتی کہ مقام ذکر خفی ہو جائے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور عظمت الٰہی کا خوف دل میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب

الصلوٰة والسلام العالم ینقش والعارف یصقل و اما صفاء السر فهو بالاجتناب عما سوی اللہ تعالیٰ و محبتہ بملازمۃ اسماء التوحید بلسان السر فی سرہ فاذا حصل لہ ھذہ الصفۃ فقد تم مقام الصاد

قلب غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائے اور آئینہ دل میقل ہونے کے بعد اس قدر شفاف ہو جائے کہ اس میں خیر و شر ایک غیبی صورت میں منقش ہو جائے (یعنی نیکی اور بدی صاف نظر آنے لگے) چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے "عالم نقش و نگار کرتا ہے اور عارف میقل کرتا ہے" یعنی عالم خیر و شر کی خوبیاں اور خامیاں واضح کر کے عمل کی تلقین کرتا ہے اور عارف دلوں کے زنگ اتارتا ہے مقام سر کی صفائی اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے روگردانی اور اس کی محبت اور اسماء توحید کا زبان کر (باطنی زبان) سے دائمی ذکر کرنے سے حاصل ہوتی ہے پس انسان جب اس صفت کا حامل ہو جاتا ہے تو مقام "ص" مکمل ہو جاتا ہے۔

واؤ:۔

و اما الواو فهو من الولایۃ وهی ترتیب علی التصفیۃ کما قال اللہ تبارک و تعالیٰ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَنتیجۃ الولایۃ ان یتخلق

"و" سے مراد ولایت ہے یہ ایک مرتبہ ہے جو تصفیہ (صفائی قلب) کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے خبردار بے شک اللہ کے دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم ان کے لئے دنیا کی زندگی میں

باخلاق اللہ تبارک و تعالیٰ کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام تخلقوا باخلاق اللہ تعالیٰ و یتلبس خلع صفات البشریۃ کما قال تبارک و تعالیٰ اذا احببت عبدًا کنت لہ سمعًا و بصرًا و لسانًا و یدًا و رِجلًا فبی یسمع و بی یبصر و بی ینطق و بی یبطش و بی یمشی فتھذبوا بما سوی اللہ تبارک و تعالیٰ کما قال جل و علا قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا فحصل مقام الواو

اور آخرت میں خوش خبری ہے۔ ولایت کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا کرے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا کرو اور جامۂ صفات بشریت اتار کر صفات الٰہی کا لباس پہنے حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں کسی بندے کو دوست رکھتا ہوں تو میں اس کے کان' آنکھ' زبان' ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں پھر وہ میرے ہی واسطے سے سنتا' دیکھتا' بولتا' پکڑتا اور چلتا ہے' ماسوا اللہ سے اپنے باطن کو پاک صاف کرو (جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اے حبیب پاک ﷺ فرمادیجئے حق آیا اور باطل کو مٹنا ہی تھا۔ پس مقام "و" حاصل ہوگیا۔

الفاء:۔

واما الفاء فهو الفناء فی اللہ جل جلالہ فاذا افنی صفات البشریہ یبقی صفات الاحدیہ و هو سبحانہ لا یفنی ولا یزول فبقی العبد الفانی مع الرب الباقی و مرضاتہ و یبقی القلب الفانی مع السر الباقی و نظیرہٗ

"ف" سے مراد فنا فی اللہ ہے جب صفات بشری فنا ہو جاتی ہیں تو صفات باری تعالیٰ باقی رہ جاتی ہیں چونکہ اس ذات پاک کو نہ زوال ہے اور نہ ہی فنا۔ لہٰذا عبد فانی کو اس غیر فانی ذات کے ساتھ اور اس کی پسندیدگی اور قبولیت

كما قال الله تبارك و تعالیٰ كل شی هالک الا وجهه يحتمل ان بالرضاء الى ما يوجه اليه من الاعمال الصالحة لوجهه و رضائه فيبقى المرضى مع الراضى ونتيجة العمل الصالح حيوة حقيقة الانسان المسمى بطفل المعانى كمال قال الله تبارک و تعالیٰ اليه يصعد الكلم الطيب والعمل الصالح يرفعه فكل عمل يكون بغير الله تعالى فيه شركة فهو هالک لعامله فاذا تم الفناء فيه حصل البقاء فی عالم القربة كما قال الله تعالیٰ فی مقعد صدق عند مليک مقتدر و هو مقام الانبياء والاولياء فی عالم اللاهوت كما قال الله تبارک و تعالیٰ والله مع الصادقين فالحادث اذا اقترن بالقديم لم يبق له وجود فاذا تم الفقر بقی الصوفی مع الحق سبحانه و تعالیٰ ابدا كما قال الله تبارک و تعالیٰ اصحاب الجنة هم فيها خالدون و كما قال الله تبارک و تعالیٰ والله مع الصابرين

(سرالاسرار:۸۸-۹۹)

سے باقی باللہ کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے اور قلب فانی کو سر باقی کے ساتھ بقا حاصل ہو جاتی ہے اس کی مثال جیساکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے لہٰذا اس کی ذات اور خوشنودی کے لئے اعمال صالحہ کی کوفت برداشت کرے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا پا لیتا ہے تو اس برگزیدہ وپسندیدہ بندے کو راضی ہونے والی ذات (یعنی اللہ تعالیٰ) کے ساتھ بقا حاصل ہو جاتی ہے اور اعمال صالحہ کا ماحصل یہ ہے کہ وہ انسان حقیقی (جو اس کے باطن کے اندر ہے) جسے طفل المعانی کہتے ہیں زندہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور جو نیک کام ہے وہ اسے بلند کرتا ہے ہر وہ عمل جس میں شرکت غیر اللہ ہو عامل کی ہلاکت کا باعث ہے مکمل فنا کے بعد عالم قرب میں بقا حاصل ہو جاتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے سچ کی مجلس میں، قدرت والے بادشاہ کے حضور یعنی اس کی بارگاہ کے مقرب ہیں اور یہ مقام عالم لاہوت میں انبیاء علیہم

السلام اور اولیاء کرام کے لئے مخصوص
ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اللہ
تعالیٰ صادقوں کے ساتھ ہے پس حادث
جب قدیم سے ملتا ہے تو اس کا اپنا وجود
باقی نہیں رہتا جب فقر مکمل ہو جاتا ہے تو
صوفی کو ہمیشہ کے لئے بقا ہے الحق کا مقام
حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے
فرمایا۔ اہل جنت ہمیشہ اس میں رہیں گے
نیز فرمایا اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ
ہے۔

معنی تصوف (حروف تصوف کی روشنی میں)

جیسا کہ قبل ازیں حضور غوث الاعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حوالے سے لفظ "تصوف" کے حروف کی روشنی میں تصوف کے معانی و معارف بیان ہوئے۔ یہاں عربی عبارت نقل کئے بغیر ہم اس سے حاصل شدہ نکات اور کچھ ضروری عنوانات کے تحت دوبارہ یہی گفتگو کریں گے تاکہ مقصود کھل کر سامنے آسکے۔

آپ کے نزدیک تصوف کی تمام تر تعلیمات کا نچوڑ لفظ تصوف کے چار حروف میں موجود ہے' سلوک' شریعت' طریقت و حقیقت کی ساری منزلیں' ان کے سارے آداب ان چار حروف سے ماخوذ تصورات کی تفصیل ہیں۔ ان چاروں حروف کا مفہوم سمجھ لیا جائے تو سارے تصوف کا ماحصل معلوم ہو جاتا ہے تو آیئے غوث الثقلین کے ارشادات کی روشنی میں ان حروف کے معانی کا جائزہ لیں تاکہ حقیقت تصوف نکھر کر ہمارے سامنے آجائے۔

پہلا حرف "تا"

آپ فرماتے ہیں کہ لفظ تصوف کا پہلا حرف "ت" توبہ سے لیا گیا ہے اور توبہ

گناہوں کی آلودگیوں سے اللہ رب العزت کے احکامات کی اطاعت وفرمانبرداری کی طرف ظاہری اور باطنی طور پر رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَ تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ
(النور ۲۴:۳۱)

تم سب مل کر اللہ کے آگے توبہ کر لو تاکہ (تمہاری گذشتہ غلطیاں معاف کی جائیں) تم فلاح پا جاؤ۔

اس آیت مبارکہ میں رب ذوالجلال نے فلاح دارین کو توبہ میں منحصر قرار دیا ہے کہ اے گروہ مومنین تم سب کے سب اللہ کی طرف لوٹ آؤ تاکہ اس کے ذریعے سے تمہیں دنیا و آخرت کی فوز و فلاح نصیب ہو جائے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا
(التحریم ۶۶:۸)

اے ایمان والو! اللہ کے آگے سچے دل سے توبہ کر لو (یعنی گناہ کا خیال بھی نہ آئے اس میں کوئی لذت ہی باقی نہ رہے)۔

مسلمانوں کو اللہ کی بارگاہ میں سچی اور خالص توبہ کرنے کا حکم ہے کہ ایسی صاف ستھری توبہ کے پانی سے تمام گناہوں کی سیاہیاں دھل جاتی ہیں اور بندہ مومن کا دل اس کے ذریعے اس طرح پاک صاف اور ہر قسم کے زنگ سے مجلی و مصفیٰ ہو جاتا ہے کہ معصیت و نافرمانی کا کوئی داغ دل پر باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا:

التائب من الذنب كمن لا ذنب له
(مشکواۃ المصابیح: ۲۰۶)

گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔

گویا توبہ ایسا پانی ہے جو قلب و باطن کو گناہوں سے اس طرح دھو کر پاک صاف کر دیتا ہے کہ گناہ کا اثر ایک ذرہ برابر بھی باقی نہیں رہتا یہاں تصوف کی اہمیت کا

اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قدر مجرب و موثر توبہ اس کا نقطہ آغاز ہے۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے گناہ نہ کرنے کا عزم کیا پھر غلطی ہو گئی اور توبہ ٹوٹ گئی اس نے دوبارہ توبہ کی کچھ عرصہ بعد پھر توبہ پر قائم نہ رہ سکا اور توبہ توڑ دی۔ تیسری بار پھر توبہ کی کچھ عرصہ بعد پھر اس کے عزم میں کمزوری آ گئی اور توبہ توڑ دی اس طرح توبہ کرتے اور توبہ توڑتے عرصہ گزر گیا حتی کہ ستر مرتبہ توبہ کی اور توڑ دی اس کے بعد ایک دفعہ تنہائی اور خلوت میں بیٹھا تھا کہ اسے توبہ کا خیال آ گیا اور اللہ کی بارگاہ سے اسے شرم و حیا آ گئی لیکن سوچنے لگا کہ میں نے ستر بار توبہ کر کے توڑ دی۔ خدا جانے اب وہ میری توبہ قبول بھی کرے گا یا نہیں۔

اس مایوسی کا خیال آنا تھا کہ غیب سے آواز آئی۔ اے میرے بندے مایوس نہ ہو۔ یہ تیرا ظرف تھا کہ تو ستر بار توبہ کرتا رہا اور توبہ توڑتا رہا۔ مگر میرے ظرف کو دیکھ کہ تو نے تو صرف ستر بار توبہ توڑ دی اگر اس سے کہیں زیادہ مرتبہ توبہ کر کے توڑ دے گا تو پھر بھی توبہ قبول کروں گا۔

صوفیاء کرام کے نزدیک راہ حق کے طالبوں کا پہلا قدم ہی توبہ ہے اگر آپ تصوف کی راہ پر چلنا چاہیں، سلوک کی منزلوں کو طے کرنے کا ارادہ کریں اور اپنے خالق حقیقی سے ٹوٹا ہوا تعلق جوڑنے کے لئے اللہ کی راہ کا مسافر بننا چاہیں تو بارگاہ خداوندی میں صدق و اخلاص کے ساتھ توبہ ہی اس سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔

توبہ کے مدراج ثلاثہ باعتبار محرکات

توبہ کے تین محرکات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر توبہ کے تین درجے بنتے ہیں اور انہی محرکات توبہ کی وجہ سے تصوف کی دنیا میں چلنے والوں کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر ہی ان کا مقام و مرتبہ متعین ہوتا ہے۔

۱۔ عذاب آخرت کے خوف کی وجہ سے توبہ (عوام الناس کی توبہ)

توبہ کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ بندہ جب گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے نتیجے میں

عذاب آخرت کا خوف اس کے دل پر غالب آجاتا ہے اور خوف کا یہ تصور اس کی توبہ کا اس طرح محرک بن جاتا ہے کہ وہ بارگاہ رب ذوالجلال میں اس خوف کی وجہ سے اپنے اعمال پر نادم ہو کر توبہ کرتا ہے۔ یہ توبہ کا پہلا درجہ ہے اور ایسی توبہ کرنے والے کو تائب کہا جاتا ہے جس کے متعلق حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ** کہ جو گناہوں سے تائب ہو جاتا ہے وہ ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کا ارتکاب ہی نہ کیا تھا۔ توبہ کی یہ صورت عوام کی توبہ کہلاتی ہے۔

۲۔ اجر و ثواب سے محرومی کے خوف کی وجہ سے توبہ (خواص کی توبہ)

توبہ اس پہلے درجے تک محدود ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس کا درجہ بلند ہو۔ توبہ کی دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ کی نعمتوں اور اس کی بارگاہ سے اور قربت کے مقام حاصل ہونے والے اجر و ثواب اور مرتبہ و مقام کا تصور دل پر غالب آجائے کہ اگر میں اسی حالت پر قائم رہا تو اللہ کی نعمتوں سے محروم کر دیا جاؤں گا بلند تر اجر و ثواب سے محرومی اور مزید طلب نعمت کے خیال کا غلبہ اس کے موجودہ رتبہ و مقام پر قائم رہنے پر ندامت کا سبب بن جاتا ہے اور اس موجودہ مقام پر قائم رہنے سے توبہ کرتا ہے تو جو شخص اس اخروی انعام و اکرام کو چاہے جس کا ذکر اللہ رب العزت نے جا بجا اپنے بندوں کے لئے فرمایا ہے ان نعمتوں کو مد نظر رکھے جو احکم الحاکمین نے اپنی بندگی کرنے والوں اور اس کی بارگاہ میں جھکنے والوں کے لئے مختص فرمائی ہیں۔ اس بلند و بالا مقام کو مد نظر رکھے جسے خالق حقیقی نے گناہوں سے رجوع کرنے والوں کے لئے اجر کے طور پر عطا فرمانے کو اپنے ذمہ کرم پر لیا ہوا ہے اور وہ اس اجر و ثواب انعام و اکرام اور نعمتوں کے حصول کے محرک کی وجہ سے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرے تو توبہ کی اس شکل کو "انابت" کہتے ہیں اور ایسی توبہ کرنے والا شخص منیب کہلاتا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی شخص کے بارے میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبِۣ ۙادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِکَ	جو اللہ سے بن دیکھے ڈرا اور ایک رجوع کرنے والا دل لے کر آیا اس کو حکم ہو

یَوۡمُ الۡخُلُوۡدِ
(قٓ،۵۰: ۳۲۔ ۳۴)

گا۔ داخل ہو جاؤ اس جنت میں سلامتی سے ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔

۳۔ خالص رضائے الٰہی کے حصول کی وجہ سے توبہ (اخص الخواص کی توبہ)

تصوف کی "تا" جس توبہ کی طرف راہنمائی کرتی ہے وہ فقط یہی مذکورہ بالا توبہ کی دو صورتیں نہیں بلکہ اس سے بھی آگے مزید قدم بڑھانے کی تحریک پیدا کرتی ہے تصوف بندۂ مومن کو صرف تائب ومنیب کے درجے پر محدود نہیں رکھنا چاہتا بلکہ اس سے مزید آگے بڑھنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے کہ توبہ کا کمال فقط انابت کے مقام کو پا کر منیب بن جانے میں ہی نہیں ہے۔ اللہ کے عذاب کے خوف اور اخروی نعمتوں کے حصول کے محرک کی وجہ سے ہی توبہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے بھی آگے توبہ ایک درجہ "اوّابیت" ہے کہ بندہ آخرت کے خوف اور نعمتوں کے چھن جانے کے خوف سے ماوراء ہو کر خالص اور محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرے تصوف کی تعلیمات سالک سے تقاضا کرتی ہیں کہ اس کی نگاہ صرف عذاب کے ڈر تک محدود نہ ہو اور نہ صرف نعمتوں کے حصول کو مطمح نظر بنا کر اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرے بلکہ اس کے پیش نظر صرف خالق حقیقی کو راضی کرنا ہو اس کی خوشنودی اس کا مقصود بن جائے جب بندے کے دل میں اللہ سے ایسی محبت اور اس کے قرب کی ایسی آرزو پیدا ہو جائے اور ہر حال میں اس کو راضی رکھنے کا ایسا احساس جاگزیں ہو جائے کہ وہ ہر لحہ اپنے سابقہ مقام کو اپنے لئے گناہ تصور کرے اور اللہ کی خوشنودی کا جویا بن کر بس اسی کے مکھڑے کا طلب گار بن جائے تو وہ توبہ کے مقام اوابیت پر فائز کر دیا جاتا ہے اور اس کو اواب کہتے ہیں۔

گویا جب اللہ کی محبت اور اس کی رضا کے حصول کی طلب کی بنا پر انسان نادم ہو جائے اور اس کو اپنے اعمال پر حیا آ جائے اور اس ندامت کے باعث توبہ ہو تو ایسی توبہ کرنے والے کو اواب کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

نِعۡمَ الۡعَبۡدُ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ
(صٓ،۳۸: ۳۰)

وہ بہت خوب بندہ تھا درحقیقت وہ (ہر

حال میں ہماری طرف) رجوع کرنے والا
بندہ تھا۔

یہ مقام اوابیت توبہ کا تیسرا درجہ ہے جہاں توبہ کا محرک صرف رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے انبیاء کرام کو یہ درجہ حاصل رہا جن کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ فرمایا گیا۔

توبہ کے تین درجات اور حضرت رابعہ بصریؒ

حضرت بی بی رابعہ بصریؒ تصوف کی دنیا میں بہت بلند مقام پر فائز تھیں۔ قرب خداوندی کا جو شرف آپ کو نصیب ہوا وہ کسی کسی کو میسر ہوتا ہے اس لئے عرفاء کاملین اور صوفیاء واصلین میں آپ کو ممتاز مقام حاصل ہے جس کا اندازہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے شاگرد رشید حضرت امام حسن بصریؒ جو جلیل القدر تابعی اور اکابر ائمہ کرام میں سے ہیں کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے کہ میرا جب کبھی دل چاہتا کہ اللہ کی باتیں سنیں اور اللہ کی معرفت سے دل کو روشن و منور کریں تو ہم حضرت بی بی رابعہ بصریؒ کی بارگاہ میں حاضری دیا کرتے۔ چنانچہ ایک رات میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ساری رات اللہ جل مجدہ کی معرفت کی باتیں ہوتی رہیں' خالق حقیقی کی رفعتوں' عظمتوں اور شانوں کے تذکرے ہوتے رہے۔ صبح جب آپ کی بارگاہ سے اٹھ کر واپس آیا تو اللہ کی عزت کی قسم ایسے محسوس ہوا کہ اللہ کی معرفت کے باب میں حضرت رابعہ بصری سمندر ہیں اور میرا دامن ایک قطرے سے بھی تر نہیں اور میری حیثیت ان کے بحر معرفت کے مقابلے میں ایک قطرہ سے بھی کم ہے۔

چنانچہ کتب تذکرہ میں معرفتِ الٰہی میں اس قدر بلند مقام کی حامل حضرت رابعہ بصری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک ہاتھ میں پانی دوسرے میں آگ اٹھا کر تیز تیز دوڑی جا رہی ہیں۔ آپ سے عرض کیا گیا ماجرا کیا ہے؟

آپ نے فرمایا کچھ لوگ دوزخ کے ڈر سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ دوزخ کو اس پانی سے بجھا دوں اور کچھ لوگ جنت کے حصول کی خاطر

عبادت کرتے ہیں اگر ہو سکے تو اس آگ سے اس جنت کو جلا دوں تاکہ کوئی دوزخ کے ڈر سے اللہ کی عبادت نہ کرے اور جنت کے حصول کے لالچ میں کوئی اظہار بندگی نہ کرے بلکہ جو بھی عبادت کرے وہ فقط اللہ کی رضا کے لئے کرے۔ عبادت کا محرک صرف اور صرف اللہ کی رضا و خوشنودی ہو۔ اللہ کی محبت اور اس کی بارگاہ کا قرب باعث عبادت ہو۔

بندوں کی تین اقسام

حضرت امام زین العابدینؓ نے فرمایا کہ بندے تین قسم کے ہوتے ہیں پہلی قسم ان بندوں کی ہے جو بظاہر تو مرد ہیں مگر حقیقت میں ان میں مردانگی نہیں بلکہ وہ عورتیں ہیں۔ دوسری قسم ان بندوں کی ہے جو نہ مرد ہیں نہ عورتیں بلکہ وہ مخنث ہیں اور تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو حقیقتاً مرد ہیں۔

پہلی قسم

وہ بندے جن کی نگاہیں طلب دنیا تک محدود رہتی ہیں اور ان کے سامنے صرف اور صرف دنیا کا حصول اور دنیا کی کامیابی مقصود ہوتی ہے وہ طالب دنیا ہیں اور جو دنیا کا طالب ہو وہ عورت ہے۔

دوسری قسم

کچھ ایسے بندے ہیں کہ دنیا ان کا مطمح نظر نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ آخرت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ان مقصود جنت اور اس کی نعمتوں کا حصول ہوتا ہے ان کی ساری کوششیں اور کاوشیں دنیا کے لئے نہیں بلکہ عقبیٰ کے حصول کے لئے ہوتی ہیں وہ لوگ طالب دنیا نہیں بلکہ طالب عقبیٰ ہوتے ہیں۔ بندوں کی یہ قسم اہلِ تصوف کے نزدیک مخنث ہے کہ وہ نہ تو طالب دنیا کی طرح عورتیں ہیں اور نہ طالب مولیٰ کی طرح مرد ہیں گویا وہ نہ مرد ہیں نہ عورتیں بلکہ مخنث ہیں۔

تیسری قسم

اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے سامنے نہ تو دنیا کی طلب ہوتی ہے اور نہ عقبیٰ کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ان کی عبادتیں ریاضتیں نہ دنیوی نعمتوں کے حصول کے لئے ہوتی ہیں اور نہ اخروی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے لئے بلکہ طلب دنیا وعقبیٰ سے صرف نظر کر کے صرف اور صرف اپنے مولا کی رضا و خوشنودی کو پیش نظر رکھتے ہیں وہ صرف طالب مولیٰ ہوتے ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی ؒ فرماتے ہیں کہ اگر میرے دل میں دنیا کا خیال آ جائے تو وضو کر لیتا ہوں تاکہ وہ خیال مٹ جائے اور دل دنیا کی طلب اور اس کے تصور سے پاک صاف ہو جائے اگر کبھی آخرت اور اس کا اندیشہ دل میں آ جائے تو میں غسل کرتا ہوں کیونکہ دنیا کا اندیشہ آخرت کے اندیشہ کے مقابلے میں کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی فکر لاحق ہو جائے تو وہ آسانی سے نکل جاتی ہے مگر آخرت کی فکر اور اندیشہ اس کے مقابلے میں مشکل سے نکلتا ہے اس لئے وضو سے بڑی طہارت یعنی غسل کرتا ہوں تاکہ یہ بڑا اندیشہ دور ہو جائے۔

گویا تصوف کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح بندہ دنیا کا طالب نہ رہے کہ دنیا غیر ہے اس طرح وہ اخروی نعمتوں اور جنت کے حصول کا طالب بھی نہ ہو کہ توحید کے اس مقام پر پہنچ کر آخرت اور اس کا حصول بھی غیر تصور کیا جاتا ہے۔ انسان دنیا کی طلب بھی دل سے نکال دے اور آخرت کی طلب کو بھی لوح قلب سے کھرچ کر صاف کر دے جب دل کی تختی دونوں طرح کے ان نقوش سے پاک و مصفی ہو جاتی ہے اور فقط مولیٰ کی طلب باقی رہ جاتی ہے اور اس کے مکھڑے کی طلب اور اس کی رضا کے حصول کی تمنا باقی رہ جاتی ہے تو پھر وہ بندہ مرد حق اور مرد حر بن جاتا ہے اور یہی وہ بندہ ہے جو روحانی اعتبار سے مرد کہلانے کا حقدار ہے اور صوفیا کی نگاہ میں اسی کو مرد تصور کیا جاتا ہے اگرچہ مادی اور جسمانی طور پر وہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن اور تصور مردانگی

اہل تصوف کے ہاں مرد کا جو تصور اوپر بیان کیا گیا یہ صرف ان صوفیاء وعرفاء کا قول نہیں بلکہ یہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور اللہ رب العزت نے ایسے لوگوں کو ہی "مرد" کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ
(النور ۲۴:۳۷)

ایسے مرد (مومن) کہ جن کو سوداگری اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور ادائیگی نماز اور ادائیگی زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔

کچھ ایسے لوگ ہیں جو تجارت اور خرید و فروخت میں مصروف ہوں تو ان کی یہ تجارت وکاروبار اور بیع و شراء انہیں اللہ رب العزت سے غافل نہیں کر سکتی اور وہ اس حالت میں بھی اپنے مولیٰ کی عبادت اس کی یاد اور اس کی محبت میں مست و بے خود ہوتے ہیں تو جس شخص پر اللہ رب العزت کی طلب اتنی غالب ہو کہ اسے نہ تو تجارت اللہ کی یاد سے غافل کر سکے۔ اور نہ دنیا کی کوئی مصروفیت اس کی راہ میں حائل ہو سکے وہ اللہ کی نگاہ میں مرد ہے۔ قرآن ایسے لوگوں کو مرد مانتا ہے کہ یہ رجال یعنی مرد ہیں اگرچہ جسمانی طور پر وہ عورتیں ہی کیوں نہ ہوں۔ گویا قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ جو لوگ یہ مقام و مرتبہ حاصل نہ کر سکیں اور اللہ کی یاد میں اس حد تک مستغرق مست اور بے خود نہ ہوں وہ مرد نہیں بلکہ عورتیں ہیں کہ مرد صرف وہی ہیں جو اس بلند مقام پر فائز ہیں اور اس کے لئے جسمانی طور پر مرد یا عورت ہونے کی کوئی تفریق نہیں۔

توبہ اور اس کے تین طریقے

توبہ جس سے تصوف کا پہلا حرف "ت" مکمل ہوتا ہے یہ توبہ تصوف کا عنصر اولین اور اس سفر معرفت کا نقطۂ آغاز اور پہلا قدم ہے اس توبہ کے تین طریقے ہیں۔

۱: توبہ کا پہلا طریقہ خطا سے صواب کی طرف توبہ کرنا۔

۲: توبہ کا دوسرا طریقہ صواب سے صواب کی طرف توبہ کرنا۔

۳: توبہ کا تیسرا طریقہ خودی سے خدا کی طرف توبہ کرنا۔

توبہ کا پہلا سفر

توبہ کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان سے غلطی اور گناہ سرزد ہونے کی صورت میں وہ اللہ جل مجدہ کی بارگاہ بے نیاز کی طرف رجوع کرے اور غلطی سے توبہ کرتے ہوئے معافی کا خواستگار ہو جس کے نتیجے میں اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں اور وہ **التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ** کا مصداق بن جائے اور ہر قسم کی گناہ کی آلودگی سے پاک صاف ہو جائے تو توبہ کے اس سفر کو خطا سے صواب کی طرف توبہ کرنا کہتے ہیں۔

توبہ کا دوسرا سفر

توبہ کا دوسرا سفر صواب سے صواب کی طرف ہوتا ہے۔ یعنی انسان پہلے بھی گناہ پر نہ ہو اس سے کوئی غلطی اور خطا سرزد نہ ہوئی ہو مگر خوب سے خوب تر کی تلاش و آرزو میں اپنے پہلے مقام و مرتبہ سے توبہ کر کے بلند و بالا اور زیادہ باعظمت مقام کی طرف رواں دواں ہو اور اس اگلے مقام رفیع کی وجہ سے پہلے مقام پر رکے رہنے کو گناہ تصور کر کے اس سے اللہ کی بارگاہ میں معافی مانگے اور اس پہلی حالت صواب سے دوسری حالت صواب کی طرف توبہ کرے اسی مقام قرب کے متلاشی لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

حسنات الابرار سیات المقربین (عام نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین کے نزدیک گناہ ہوتے ہیں) گویا یہ مقام بر سے مقام قرب کی طرف سفر ہے اور اس سفر کا راہی مقام بر سے مقام قرب کی طرف توبہ کرتا ہے۔

توبہ کا تیسرا سفر

توبہ کا تیسرا سفر خودی سے خدا کی طرف ہوتا ہے اہل محبت جب مقام قرب

دمحبت پر پہنچتے ہیں اور ان کا تعلق محبت محبوب کے ساتھ پختہ ہو جاتا ہے تو اس محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اس محبت کے آداب بجالاتے ہوئے اپنی خواہش و آرزو سے بھی دستبردار ہو جائیں تاکہ وہ اپنی ہستی اور اس کے جملہ تقاضوں سے دستکش ہو کر اپنی مرضی کو محبوب کی مرضی میں فنا کردیں۔ اور فنافی اللہ کے منصب پر فائز ہو جائیں یہ توبہ کا وہ سفر ہے جہاں خودی ختم ہو جائے انسان اپنا وجود اور اس کی کوئی خواہش باقی نہ رہے اور محبوب کی رضا میں اپنے آپ کو اس طرح گم کر دے کہ وہ اپنی آرزو کے ساتھ فانی ہو جائے اور محبوب کی مرضی و رضا کے ساتھ باقی ہو جائے۔

اس مرحلۂ توبہ کی وضاحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے کہ جب آپ کوہ طور پر تشریف لے گئے تو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اپنی آرزو کا اظہار کیا۔

قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ
(الاعراف '۷: ۱۴۳)

موسیٰ علیہ السلام نے دیدار کی آرزو میں عرض کی اے میرے رب تو مجھ کو (اپنا جلوہ) دکھادے تاکہ میں تجھ کو دیکھ (بھی) لوں۔

محبوب حقیقی کے کلام سے متمتع ہونے کے بعد دل میں خواہش دیدار پیدا ہوئی اور اس حسن حقیقی کو دیکھنے کے اشتیاق کا اظہار کر دیا۔ دیدار حسن لم یزل کی خواہش آرزو بن کر زبان پر مچل گئی تو ادھر سے جواب ملا۔ لَنْ تَرٰانِیْ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے اور جب رب ذوالجلال نے کوہ طور پر ایک تجلی کا پرتو ڈالا تو آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے جونہی ہوش آیا تو سب سے پہلے فوراً اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض کی۔

تُبْتُ اِلَیْکَ

مولیٰ! میں تیری بارگاہ کی طرف توبہ کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ جل مجدہ کے نبی اور رسول ہیں۔ (انبیاء خطا سے پاک ہوتے ہیں) آپ نے بھی کسی غلطی کا ارتکاب نہ کیا تھا جس سے توبہ کی جاتی

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ یہ توبہ کس چیز سے فرما رہے ہیں؟

صاف ظاہر ہے کہ آپ نے کوئی معصیت و نافرمانی کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ آپ راہ صواب و حق پر ثابت تھے اور آپ کی یہ توبہ اپنی خواہش و آرزو سے توبہ تھی کہ احکم الحاکمین تیری بارگاہ میں دیدار کی تمنا کر بیٹھا اس اختیار سے توبہ کرتا ہوں اس آرزو کو چھوڑتا ہوں اور اپنی مرضی سے تیری مرضی کی طرف دستبردار ہوتا ہوں۔

گویا اس سفر کے راہی خود کو اپنے محبوب کے اس طرح سپرد کر دیتے ہیں کہ محبوب کے دیدار کی آرزو بھی اپنے بس میں نہیں رکھتے۔ محبوب کے حسن کے نظارے کی تمنا سے بھی تائب ہو جاتے ہیں۔ یہاں دنیا اور آخرت کی آرزو' درجات اور اجرو ثواب کی آرزو تو بہت پیچھے رہ گئی۔ انسانی آرزوؤں میں سے سب سے بڑی خواہش تو دیدار محبوب حقیقی کی خواہش ہے اور اسی خواہش کا اظہار موسیٰ علیہ السلام نے **رب ارنی** کے الفاظ سے فرمایا تھا لیکن جب خودی سے خدا کی طرف توبہ کا مرحلہ آیا تو پھر عرض کی کہ باری تعالیٰ اس آرزو کو اختیار کرنے سے بھی توبہ کرتا ہوں۔

توبہ کا یہ درجہ سرور کون و مکان رحمت دوجہاں ﷺ کی ذات گرامی کو بہ تمام و کمال حاصل تھا۔ آپ نے اپنی خواہش آرزو کو اپنے خالق حقیقی کی رضا و خوشنودی میں اس طرح فنا کر دیا کہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ۝ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی	اور وہ اپنی (یعنی نفس کی) خواہش سے بات ہی نہیں کرتے وہ تو وہی فرماتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ان پر وحی کی جاتی ہے۔
(النجم' ۵۳: ۳-۴)	

کہ آپ کا بولنا بھی اپنی مرضی سے نہیں دن کی جلوت ہو یا رات کی خلوت سفر میں ہوں یا حضر میں' خوشی کی حالت میں ہوں یا حالت غم میں' اپنوں کی محفل میں ہوں یا مخالفین کے پاس ہوں ہر حال میں آپ کی زبان سے اپنی مرضی سے تو ایک کلمہ بھی نہیں نکلتا بلکہ آپ کا تکلم و سکوت سب کچھ اللہ رب العزت کی رضا کے تابع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے

ساتھ نماز ادا فرمائی اور دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا۔ آپ کی خدمت میں عرض کی گئی کہ

یا رسول اللہ ﷺ انسمت ام قصرت الصلوٰۃ فقال لم انس فلم تقصر (مشکوٰۃ المصابیح: ۹۴)	یا رسول اللہ ﷺ آپ بھول گئے یا نماز میں کمی کر دی گئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ نہ تو میں بھولا ہوں اور نہ ہی نماز میں قصر کی گئی ہے۔

آپ کی حالت نماز بھی آپ کی اپنی مرضی سے متعین نہ ہوتی تھی بلکہ عبادت کی حالت بھی احکم الحاکمین کی رضا و مرضی کے مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ ایک دن میں ستر ستر بار توبہ فرماتے تھے اور مسلم شریف میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا میں دن میں ۱۰۰ مرتبہ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ اس توبہ و استغفار کا کیا معنی تھا؟ یہ گناہوں اور غلطیوں سے توبہ نہ تھی بلکہ یہ ہر قدم پر آرزو اور خواہش کے اختیار کرنے سے توبہ ہوتی تھی۔

ایک شبہ کا ازالہ

توبہ صرف گناہوں سے ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ توبہ اعلیٰ ترین سفر آرزو سے دستبردار ہونے سے عبارت ہے اور آپ ﷺ کی توبہ یہی ہوا کرتی تھی کیونکہ آپ گناہوں اور غلطیوں کے ارتکاب سے معصوم تھے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

لِیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح، ۲:۴۸)	کیونکہ اللہ آپ کی اگلی اور پچھلی لغزشوں کو معاف فرما چکا ہے۔

یہاں "ذنبک" کا لفظ قابل توجہ ہے اس کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی تو وہ ہے جو اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت الشاہ احمد رضا خاں قدس سرہ العزیز نے فرمایا:

تاکہ محبوب تمہاری خاطر اللہ رب العزت تمہارے اگلوں اور پچھلوں کو بخش

یہ معنی نہایت محتاط اور آداب کے تقاضوں کے عین مطابق اور برحق ہے مگر بعض لوگوں نے یہاں ذنب سے مراد گناہ لیا ہے اور معاذاللہ حضور ﷺ کے لئے گناہ ثابت کیا ہے حالانکہ یہاں "ذنب" سے مراد آپ کا گناہ ہرگز نہیں ہے بالفرض ایک لمحہ کے لئے اس کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو گناہ کا وجود نہیں بنتا کیونکہ گناہ سے توبہ کی صورت میں گناہ پہلے ہوتا ہے اور مغفرت اس کے بعد ہوا کرتی ہے اور اس مغفرت کی وجہ سے گناہ کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسے ہے
(مشکوٰۃ المصابیح:۲۰۶) گویا اس کا گناہ تھا ہی نہیں۔

گناہ سے توبہ کرنے والے کا گناہ ہوتا ہے مگر توبہ کی وجہ سے مغفرت کے بعد گناہ مٹ جاتا ہے لیکن حضور ﷺ کی توبہ کا یہ عالم ہے کہ اللہ رب العزت آپ کے گناہ کے وجود سے پہلے ہی مغفرت عطا فرما دیتا ہے مطلب یہ کہ ابھی گناہ ہوتا ہی نہیں کہ مغفرت پہلے عطا کر دی جاتی ہے اور مغفرت آ جائے تو گناہ کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے تو جب گناہ کے وجود سے بھی پہلے حضور ﷺ کو مغفرت عطا فرما دی گئی تو وہاں گناہ کا گزر کیسے ہوگا؟

گویا اس آیت مبارکہ میں اللہ جل مجدہ نے اپنے محبوب کریم ﷺ سے ارشاد فرمایا کہ پیارے محبوب تیری توبہ ایسی ہے کہ گناہ کا وجود ہی تیری زندگی مطہرہ کے قریب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تجھے تو پہلے ہی سے مغفرت کی خیرات عطا فرما دی گئی ہے۔ جب گناہ حضور ﷺ کی زندگی میں باقی ہی نہیں رہنے دیا گیا تو آپ کی توبہ کیسی اور کس لئے تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی توبہ درجات کی بلندی کے لئے ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سے اللہ رب العزت ہر لمحہ آپ کے درجات بلند سے بلند تر فرماتا ہے جس کی وضاحت قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ فرما رہی ہے۔

وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی ہر پچھلی
(الضحیٰ ۴:۹۳) حالت اگلی حالت سے بہتر ہے۔ (آپ

کے عروج ہی عروج ہے)

آپ کی ہر آنے والی گھڑی پہلی گھڑی سے بہتر ہے حضور ﷺ توبہ فرماتے جس کے ذریعے ہر لحہ آپ کے درجات بلند ہوتے اور یہ سلسلہ ساری حیات طیبہ میں جاری وساری رہا۔

خلاصۂ کلام

حضور غوث الثقلین محی الدین عبد القادر جیلانیؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوف کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ انسان اللہ رب العزت کی بارگاہ کی طرف راغب ومتوجہ ہو جائے۔ تصوف کا پہلا حرف۔ "التا" ہے جس کا معنی توبہ ہے۔

توبہ کی دو قسمیں ہیں۔

۱: ظاہری توبہ ۲: باطنی توبہ

توبہ ظاہری

توبہ ظاہری یہ ہے کہ انسان قولاً وفعلاً اپنے تمام اعضائے ظاہری (آنکھ ' ناک ' کان ' ہاتھ اور پاؤں وغیرہ) کو گناہوں اور برائیوں سے ہٹا کر اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کی طرف راغب کر دے۔ نیز شریعت مصطفوی علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات کے مخالف افعال سے توبہ کر کے اس کے احکامات کے مطابق عمل پیرا ہو۔

توبہ باطنی

توبہ باطنی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دل کو گناہوں کی غلاظتوں اور آلائشوں سے پاک کر کے شریعت کے موافق اعمال صالحہ کی طرف راجع کردے جب انسان کا ظاہر حکم الہی کے موافق ہو جائے اور قلب وباطن بھی امر ایزدی کی اطاعت میں ڈھل جائے اور برائی نیکی سے بدل جائے تو تصوف کی "ت" مکمل ہو گی اور اس کو کامل توبہ نصیب ہو گی۔

تصوف کا دوسرا حرف "ص"

اب ہم لفظ تصوف کے دوسرے حرف "الصاد" کی تشریح و توضیح کر رہے ہیں۔ قبل ازیں تفصیلاً ذکر ہو چکا ہے کہ تصوف کے حرف ثانی یعنی "ص" سے مراد صفا ہے اور صفا کی دو قسمیں ہیں۔

۱: صفائے قلب ۲: صفائے سر

صفائے قلب

قلب کی صفائی سے مراد یہ ہے کہ دل ان بشری کدورتوں اور آلائشوں سے پاک صاف ہو جائے جو عموماً دل کے اندر پائی جاتی ہیں اور دل پر اثر انداز ہوتی ہیں مثلاً زیادہ کھانے پینے، سونے اور زیادہ گفتگو کرنے کی خواہشات نیز دنیوی رغبتیں مثلاً زیادہ کمائی، کثرت جماع اور اہل و عیال کی حد سے زیادہ محبت۔

اسی طرح دیگر خواہشات نفسانی تکبر و غرور، حسد و کینہ، بغض و عناد، سرکشی وعداوت اور منافقت و کدورت ایسے رذائلِ اخلاق جن سے دل سیاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر دل ان تمام مذمومہ اخلاق سے منزہ و مبرا ہو جائے تو اسی کو صفائے قلب کہتے ہیں۔

صفائے سر

علم روحانیت میں قلب، جسم کا باطن ہوتا ہے اور سر، قلب کا بھی باطن ہوتا ہے جیساکہ اوپر پہلے بیان ہو چکا ہے کہ دل (قلب) کا رذائل اخلاق سے پاک ہو جانا صفائے قلب کہلاتا ہے جبکہ صفائے سر (مقام سر کی صفائی) سے مراد یہ ہے کہ نہ صرف دل کی ظلمتیں دھل جائیں بلکہ دل اللہ تعالیٰ کے سوا کے خیال سے اس طرح پاک ہو جائے کہ اللہ کے غیر کا تصور بھی ختم ہو جائے تو جب ماسوٰی المحبوب ہر چیز کے تصور وگمان سے دل بے نیاز ہو کر محبوب حقیقی کے انوار و تجلیات میں اس طرح گم ہو جائے کہ غیر کا تصور بھی گوارا نہ ہو تو اس کو صفائے سر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب انسان مقام سر کی صفائی حاصل کر لیتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں اللہ

تعالیٰ کے سوا کسی اور کا تصور و خیال بھی نہیں آنے پاتا بس صرف مالک حقیقی کے مکھڑے کی طلب اور اس کی رضا و خوشنودی کا حصول ہر لحہ مقصود و مطلوب بن کر اس طرح چھا جاتا ہے کہ صبح و شام یہی ایک چیز ان کا وظیفہ حیات بن جاتی ہے ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ وحدہ لاشریک ارشاد فرماتے ہیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الکہف' ۱۸:۲۸)

اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) آپ اپنے آپ کو انہیں کے ساتھ روکے رہیے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام (رات دن ہر وقت) یاد کرتے رہتے ہیں جو اس کی رضا کے طالب ہیں۔

یہ لوگ دن رات اپنے رب کریم کو پکارتے رہتے ہیں' ان کے اس عمل میں کسی غیر کا خوف دل میں جاگزیں نہیں ہوتا اور نہ ہی غیر کے احساس کو قلب و باطن پر اثر انداز ہونے دیتے ہیں نہ کوئی طلب انہیں دامن گیر ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کا طمع و لالچ ان کے دل میں جگہ پا سکتا ہے اللہ کی مخلوق کی بھلائی کے کام میں مصروف ہوں یا کاروبار و تجارت میں محو' اپنوں کی محفل میں ہوں یا بیگانوں کی مجلس میں ہر حال میں ان کے ہر عمل کا مقصود اللہ کی رضا ہوتا ہے۔

اپنے محبوب کی طلب رضا کے اس راستے پر چلتے چلتے ان کا مقام سر اتنا صاف اور اجلا ہو جاتا ہے کہ انہیں مقام توحید میسر آ جاتا ہے۔ جہاں پہنچ کر غیر خدا کے خیال اور ماسویٰ المحبوب کے تصور سے مکمل طور پر آزاد ہو کر فنا فی اللہ کی منزل میسر آ جاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صفائے سر

بعض عرفاء نے مقام سر میں اللہ رب العزت کے تعلق کی کیفیت بیان کی ہے۔ مقام سر اور مقام توحید جو صفائے سر سے نصیب ہوتا ہے وہاں اللہ کی ذات کے ساتھ ایک ایسا تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ اس تعلق کے ہوتے ہوئے چشم تصور و خیال میں

کسی اور کا خیال گزرنے نہیں پاتا اور توحید کا درجہ مکمل ہو جاتا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ ایک رات میں بیدار ہوئی اور حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ بستر پر نہیں ہیں۔ میں تلاش کرتے کرتے آپ کی خدمت میں پہنچ گئی دیکھا کہ آپ عبادت میں مشغول و مصروف ہیں، میں آپ کے پاس بیٹھ گئی اور آپ کی خدمت میں کچھ عرض کیا کہ آپ نے میری آواز سن کر ارشاد فرمایا:

من انت: تو کون ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں میں نے عرض کی۔

انا عائشہ یا رسول اللہ! یا رسول اللہ میں عائشہ ہوں۔ حضور ﷺ نے یہ سن کر فرمایا۔

من عائشہ؟ کون عائشہ؟ آپ فرماتی ہیں کہ میں گھبرا گئی لیکن پھر سنبھل کر جواب دیا۔

"انا عائشہ بنت ابی بکر" میں ابو بکرؓ کی بیٹی عائشہ ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

"من ابو بکر؟ کون ابو بکر" میں نے جواباً عرض کیا۔

ابو بکر بن قحافہ یا رسول اللہ! یا رسول اللہ! ابو بکر ابو قحافہ کے بیٹے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

من ابو قحافہ۔ کون ابو قحافہ۔ آپ فرماتی ہیں کہ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو میں گھبرا کر واپس پلٹ آئی۔

تصوف کا تیسرا حرف "و"

تصوف کا تیسرا حرف "و" ولایت سے لیا گیا ہے۔ ولایت کو عرف عام میں "دوستی" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور صاحب ولایت کو ولی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ولی اللہ کا معنی ہوا اللہ کا دوست۔

ولی اللہ اور عام بندہ میں فرق

بندہ ہونے کے اعتبار سے تو تمام انسان اللہ کے بندے ہیں مگر تمام بندے ایک جیسے نہیں ہوتے کیونکہ بعض لوگ بندہ ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت کے دوست بھی ہوتے ہیں جنہیں یہ مقام میسر آتا ہے ان میں اور عام بندوں میں بہت فرق ہوتا ہے کیونکہ بندہ ہونے کے اعتبار سے تو کائنات عالم کی ہر ہر چیز اللہ کا بندہ ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا

(سورہ مریم ۱۹: ۹۳)

(حقیقت تو یہ ہے کہ) آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے (طوق بندگی سے کوئی باہر نہیں سب اس کے بنائے ہوئے ہیں اور) سب (اللہ) رحمٰن کے روبرو بندے کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔

مگر اللہ کے دوست وہی بندے ہیں جو اپنے رب سے دوستی کا رشتہ استوار کرتے ہیں۔ اس طرح "ولی اللہ" اللہ کا دوست بن جاتا ہے اور اللہ رب العزت اس بندے کا دوست بن جاتا ہے تصوف اسی ولایت کے حصول کا ذریعہ ہے اور اس کی جملہ تعلیمات بندے کو مقام ولایت پر فائز ہونے کا راستہ بتاتی ہیں کہ بندہ اللہ کا دوست بن جائے اور رب بندے کا دوست بن جائے۔ اس دو طرفہ تعلق کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔

اِنْ اَوْلِیَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ

(الانفال ۸: ۳۴)

اس کے متولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی۔

ایسے متقی افراد جو مقام ولایت کے حامل ہوتے ہیں وہ ایک طرف تو اللہ کے دوست ہوتے ہیں جس کو سابقہ آیت مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے اور دوسری طرف اللہ ان لوگوں کا دوست ہوتا ہے جس کو قرآن مجید میں دوسری جگہ بیان فرمایا گیا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ

(البقرہ ۲: ۲۵۷)

اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے وہ ان کو تاریکیوں میں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔

پہلی آیت میں بندہ ولی اللہ تھا اور اس آیت میں اللہ رب العزت ولی العبد ہے ادھر بندہ اللہ کا ولی ہے ادھر اللہ بندے کا ولی۔ وہاں بندے سے اللہ کی دوستی کا بیان تھا یہاں اللہ سے بندے کی دوستی کا بیان ہے۔

ایک لطیف نکتہ

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں پہلے بندے کی طرف سے اللہ کے لئے دوستی و محبت کا بیان نہیں بلکہ پہلے اللہ کی طرف سے بندے کے لئے محبت و دوستی کا بیان ہے گویا پہلے اللہ اپنے بندے کو چاہتا ہے اور اس کے ساتھ دوستی کرتا ہے اور پھر بندہ اپنے رب سے محبت کرتا اور دوستی لگاتا ہے۔ گویا بندے کو اللہ کی دوستی کی دولت اس وقت تک میسر نہیں آسکتی جب تک پہلے اللہ اپنے بندے سے محبت و دوستی نہ کرے اور بندہ اپنے رب کو اس وقت تک محبوب نہیں بنا سکتا جب تک کہ رب العزت اپنے بندے کو اپنا محبوب نہ بنالے۔ بندہ رب سے محبت کرتا ہے اور رب بندے کو محبوب بنالیتا ہے جس طرح یہ محبت دو طرفہ ہے اسی طرح رضا بھی دو طرفہ ہے ارشاد فرمایا:

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ — اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

پہلے اللہ اپنے بندوں سے راضی ہوا۔ اس کے اس کرم سے بندوں کو توفیق نصیب ہوئی اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے تعلق یکطرفہ نہیں بلکہ دونوں طرف سے ہے۔ اسی طرح دو طرفہ تعلق کو ایک اور جگہ بیان فرمایا:

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً
(الفجر ۸۹: ۲۸-۲۷)

اے وہ نفس جس نے اطمینان حاصل کر لیا تو اپنے رب کی طرف واپس چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔

ان آیات مبارکہ سے یہ واضح ہو گیا کہ بندے اور رب کے درمیان محبت و دوستی بھی دو طرفہ اور رضا بھی دو طرفہ ہے ایک حیثیت میں بندہ محب ہوتا ہے اور دوسری حیثیت میں محبوب۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ — اے حبیب ﷺ آپ فرما دیجئے اگر تم

یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ　　　　اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو
(آل عمران ' ۳:۳۱)　　　　اللہ تم کو محبوب رکھے گا۔

اگر تم اللہ کا محب بننا چاہتے ہو تو حضور ﷺ کے غلام بن جاؤ آپ کی غلامی واتباع کو اختیار کرلو تو اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالے گا یعنی یہ نبی اکرم ﷺ ایسے محبوب ہیں کہ جو ان کا غلام بن جاتا ہے اللہ رب العزت اسے بھی اپنا محبوب بنا لیتا ہے اور بندے کا تعلق یکطرفہ بلکہ دو طرفہ ہو جاتا ہے۔

ولایت اور تقویٰ کا باہمی تعلق

سورہ الانفال کی مذکورہ آیت مبارکہ میں اللہ کے دوستوں اور ولایت کے مقام پر فائز ہونے والوں کی ایک صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ متقی ہوتے ہیں۔ یعنی ولایت اور تقویٰ دونوں باہم لازم وملزوم ہیں۔ تقویٰ کے بغیر ولایت کا تصور گمراہی ہے اور جو مقام ولایت کو پانا چاہتا ہے اسے تقویٰ کے لباس کو پہننا ضروری ولازم ہوتا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بھنگ چرس پینے والے اور شریعت مطہرہ کی مخالفت کرنے والے مقام ولایت پر کبھی فائز نہیں ہو سکتے۔ نمازوں کے تارک شیطان کے دوست تو ہو سکتے ہیں اللہ کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اللہ رب العزت نے اپنے دوستوں کی پہچان کروا دی ہے کہ وہ متقی پرہیزگار اور شریعت مطہرہ کی پابندی کرنے والے ہوتے ہیں۔

اس آیت نے اس تصور کو مکمل طور پر باطل کر دیا جو جہالت کی بنا پر ہمارے اندر رواج پا گیا ہے کہ فلاں شخص نماز روزے کا پابند تو نہیں ہے مگر ہے بڑا کامل ولی اللہ شریعت کی پابندی وپاسداری کو اپنے اوپر لازم نہیں سمجھتا مگر بہت پہنچا ہوا اور بہت بزرگ ولی ہے۔ یہ سوچ سراسر اسلام کے خلاف اور دین دشمنی پر مشتمل ہے۔

مجذوب (مدہوش) شریعت کا مکلف نہیں ہوتا اس لئے اس سے شریعت کے احکامات کی پابندی ساقط ہو جاتی ہے مگر صاحبان ہوش کے لئے مقام ولایت پر فائز ہونے کے لئے شریعت کی پابندی ہی اصل بنیاد ہے اور جو شریعت کا پابند نہ ہو وہ شیطان کی

بارگاہ میں پہنچا ہوا تو ہو سکتا ہے اللہ کی بارگاہ کا قرب اسے میسر نہیں آسکتا وہ ولی شیطان تو ہو سکتا ہے ولی اللہ نہیں ہو سکتا۔

آج تصوف' طریقت اور سلوک کے نام پر بڑا دجل وفریب اور مکاری وعیاری ہو رہی ہے جس نے بزرگوں کے طریقوں اور طریقت وروحانیت کو بدنام کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں نوجوان نسل اور پڑھا لکھا جدید تعلیم یافتہ طبقہ صوفیاء بزرگوں اور کاملین کے طریقۂ زیست کی طرف جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس پورے سلسلے میں دھوکہ وفریب ہے اس لئے اس حقیقت کو واضح کر دینا ضروری ہے تاکہ طریقت وروحانیت کا چہرہ نکھر کر سامنے آجائے۔ جہاں شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوات کی پابندی اور حضور ﷺ کی سنت کی اتباع واطاعت موجود نہ ہو گی وہاں ولایت کا وجود ناممکن ہو گا۔ اس کتاب میں انشاء اللہ اس اصل ولایت کی پہچان کرائی جائے گی جس سے دجل وفریب پر مشتمل' عیاری ومکاری کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ اور حق کے متلاشی حقیقت تصوف سے آگاہ ہو کر روحانیت وطریقت کی حقیقتوں سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔

لفظ ولی کا معنیٰ و مفہوم

یہ واضح ہو چکا کہ بندہ اللہ کا ولی ہے اور اللہ بندے کا ولی ہے اس دو طرفہ تعلق کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری تھا کہ لفظ ولی کا معنی ومفہوم سمجھ لیا جائے تاکہ دو طرفہ تعلق میں ولی اللہ اور ولی العبد کا معنی واضح ہو سکے۔

لفظ ولی ولایت (واؤ پر زیر) اور ولایت (واؤ پر زبر) دونوں سے مشتق ہے۔ ولایت کا معنی تصرف اور ملکیت ہے۔ جب بچہ چھوٹا اور نابالغ ہوتا ہے اور اپنے امور سرانجام نہیں دے سکتا تو اس کا باپ، دادا یا بھائی اس کا ولی بن جاتا ہے اور اس کو ولایت حاصل ہوتی ہے یعنی وہ ولی اس بچے کی جگہ اس کے مال جائیداد میں تصرف کرتا ہے اور اس ولی کا فعل اسی بچے کا کام تصور کیا جاتا ہے وہ خرید وفروخت کرے یا معاہدہ کرے' عقد نکاح کرے یا اس کی طرف سے کوئی اور کام وہ سب کچھ اسی بچے کا ولی ہونے کی

وجہ سے بچے کا عمل ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ لفظ ولی ولایت سے بھی ہے اور ولایت کا معنی امارت' بادشاہی اور حکمرانی ہے اس سے ماخوذ ہونے کی بنا پر ولی کا معنی حکم چلانے والا حکمران و بادشاہ ہو گا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک کی ولایت فلاں شخص کے پاس ہے یعنی فلاں ملک کی حکمرانی اس کے پاس ہے۔

اب ان دونوں حصوں کی رو سے ولی کا مفہوم یہ ہوا کہ جس کا جو ولی ہو وہ اس کی طرف سے حق تصرف رکھتا ہے اور اسی طرح وہ شخص جو کسی پر حکمران یا بادشاہ ہو وہ بھی اپنے محکوم کا ولی ہے۔

ولی اللہ اور ولی العبد

جیسا کہ پہلے واضح ہو چکا ہے کہ ولی معنی تصرف کرنے والا اور حکمران، و بادشاہ کے ہیں مگر اس کا تعین اس کے مضاف الیہ کا تعین کرنے سے ہوتا ہے۔ مضاف الیہ کے مختلف ہونے سے لفظ ولی کی کئی مختلف صورتیں بنتی ہیں مگر اس وقت ہمارے پیش نظر صرف دو صورتیں ہیں۔

۱: ولی اللہ۔ جبکہ ولی کا مضاف الیہ لفظ اللہ ہو۔

۲: ولی العبد۔ جبکہ ولی کا مضاف الیہ لفظ عبد ہو۔

کیونکہ یہی دو صورتیں زیر بحث ہیں کہ بندہ اللہ کا ولی ہے جس کو **اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** اور **اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ** میں بیان کیا گیا ہے اور اللہ بندے کا ولی ہے جس کو **اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** کے ذریعے بیان کیا گیا ہے اور ان دونوں صورتوں میں ولی کا معنی و مفہوم کیا ہے اس کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہے تاکہ اس کی وضاحت ہو سکے کہ بندہ اللہ کا ولی کیسے اور کس معنی میں ہوتا ہے۔

ولی العبد کا معنی و مفہوم

اللہ رب العزت بندے کا ولی ہے اور ولی العبد کا معنی ولی کے پہلے معنی کی رو

سے یہ ہوا کہ بندے نے اپنا تصرف کا مقام حق ختم کر کے اسے اللہ کی بارگاہ میں پیش کر دیا اور اس نے اپنی زندگی کے جملہ معاملات میں اپنے ارادے اور مرضی سے دستبردار ہو کر اپنے تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کر دیا اور اللہ نے اسے قبول کر لیا تو رب اپنے بندے کا ولی ہو گیا اب اس بندے کے تمام معاملات وہ خود نبھائے گا کیونکہ بندے نے اپنے تمام امور اپنے مولا کریم کو تفویض کر دیئے ہیں اور اعلان کر دیا ہے۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ (غافر، ۴۰: ۴۴)

میں اپنا معاملہ اللہ رب العزت کے سپرد کرتا ہوں۔

میں اپنی زندگ کے جملہ امور کو اپنی مرضی سے نکال کر تیری مرضی کی تحویل میں دیتا ہوں۔ اپنے اختیار سے دستبردار ہو کر اپنا سب کچھ تیرے اختیار کے حوالے کرتا ہوں۔

قُلْ اِنَّ صَلوٰتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام، ۶: ۱۶۳)

آپ فرما دیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی (مناسک حج) اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔

جب بندہ اپنا جینا مرنا، کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا عزت و آبرو، شہرت ناموری، بیماری و صحت سب کچھ اللہ رب العالمین کے سپرد کر دیتا ہے تو اللہ فرماتا ہے لوگو! میں اپنے اس بندے کا ولی ہوں اس کے جملہ معاملات میں نے اپنے ذمے لے لئے اور اپنے وہ معاملات جو بندوں کی رشد و ہدایت اور ان کی اصلاح احوال سے متعلق تھے وہ اپنے اس بندے کو دے دیئے تو اب سن لو کہ اس کے تمام معاملات میں خود نبھاؤں گا۔

ولی کے دوسرے معنی کی رو سے ولی العبد کا معنی یہ ہوا کہ اس بندے پر اگر حکمرانی ہے تو وہ صرف اللہ کی ہے اس بندہ نے اپنے آپ کو اللہ کی حکمرانی میں دے دیا ہے اب دنیا کا کوئی فرد اس پر حکمران نہیں ہوتا اس پر حکمرانی صرف اپنے رب کی ہوتی

ہے نہ وہ کسی سے خوف کھاتا ہے بلکہ ڈرتا ہے تو صرف اپنے رب سے' وقت کا بڑے سے بڑا فرعون اور قارون بھی اپنے مال ودولت اور سرمایہ سے اسے خرید نہیں سکتا کیونکہ وہ اپنے رب کے حضور اپنے آپ کو بیچ چکا ہوتا ہے اس لئے وہ کسی غیر کی حکمرانی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صرف اس طرف چلتا ہے جدھر رب چلاتا ہے وہاں جھکتا ہے جہاں رب جھکاتا ہے اس نے اپنے اوپر صرف رب کی حکمرانی قائم کی ہوتی ہے اور اللہ اسے دنیا کائنات کی حکمرانی دے دیتا ہے اللہ اس کا ولی ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کا ولی ہوتا ہے اور بندے کا ولی کیسے اور کس معنی میں ہوتا ہے۔

من کان للہ کان اللہ لہ جو اپنے آپ کو اللہ رب العزت کے لئے وقف کر دے اور اپنے معاملات کو بھول جائے تو اس کے معاملات کی ادائیگی اللہ رب العزت اپنے ذمہ کرم پر لے لیتا ہے۔

حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ سے کسی نے سوال کیا کہ آپ کے کام زیادہ ہوتے ہیں۔ خلافت کی مصروفیات لوگوں کے مسائل' جہاد کے معاملات وغیرہ اتنے زیادہ کام آپ کیسے سرانجام دے لیتے ہیں۔ ان تمام کے لئے آپ وقت کیسے نکالتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنی بساط کے مطابق اپنے رب کے کام کرتا رہتا ہوں اور جب کبھی میرے ذاتی کام اور اللہ کے کام میں تعارض پیدا ہو یعنی ایک وقت میں یا اللہ کا کام ہو سکتا ہے یا اپنا کام تو ایسی حالت میں میری زندگی کا معمول یہ ہے کہ میں اپنا کام چھوڑ دیتا ہوں اور اللہ رب العزت کا کام کرتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرا ذاتی کام میرے کرنے سے بھی بہتر طریقے سے سرانجام پاتا ہے کہ ایسی صورت میں میرا کام میرا رب اپنے ذمہ لے لیتا ہے جبکہ میں اس کا کام اپنے ذمہ لیتا ہوں کیونکہ ایسی صورت میں اللہ رب العزت اپنے بندے کا ولی بن جاتا ہے اور اس کا سرانجام دیا ہوا کام ہر قسم کے نقص وکمی سے محفوظ ہوتا ہے اور وہ بندے کے سرانجام دینے کی نسبت ہزار ہا گنا بہتر ہوتا ہے۔

ولی اللہ کا معنیٰ و مفہوم

بندہ اللہ کا ولی ہے ولی کے پہلے معنیٰ کی رو سے ولی اللہ کا معنی یہ ہوا کہ وہ بندہ جو اللہ کی طرف سے تصرّف کا حق رکھتا ہے اللہ رب العزت نے اس کو تصرف کا حق دے دیا ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ رب العزت کی طرف سے کرتا ہے لیکن اللہ رب العزت تو ہر قسم کے نقص یا کمزوری سے پاک ذات ہے تو بندہ اللہ کا ولی کس معاملے میں بنتا ہے؟ اللہ کو کسی معاملہ میں بھی کسی دوسرے کی ولایت کی حاجت نہیں وہ اس سے پاک اور بے نیاز ذات ہے لیکن اس نے محض اپنے فضل واحسان سے اپنے خاص بندوں کو نوازنے کے لئے بنی نوع انسان کی رشد وہدایت' ان کی اصلاح احوال کے بہت سے معاملات ان کے سپرد فرمادیے ہیں۔ اللہ کی طرف سے بندے کو ان معاملات کی سپردگی کو ولایت کہتے ہیں۔ اور یہ معاملات جس کے سپرد کئے جاتے ہیں اس کو ولی اللہ کہتے ہیں۔

اگر وہ ولایت میں کامل ہو تو جو فیصلہ وہ کرتا ہے وہی رب کا فیصلہ ہوتا ہے چونکہ وہ اللہ کا ولی ہے اور اللہ نے ان امور پر اس کو متصرف بنایا ہے اس لئے اسے اللہ رب العزت ارشاد فرمادیتا ہے کہ میرے بندے جو تیرا فیصلہ ہوگا وہی میرا فیصلہ ہوگا جو تیرا کہنا ہوگا وہ تیرا نہیں میرا کہنا ہوگا۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

یہ مقام ولایت جس کو عطا کیا جاتا ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا۔

من عادلی ولیا فقد اذنتہ بالحرب جس نے میرے ولی سے عداوت رکھی میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔ (صحیح بخاری' ۲: ۹۶۳)

کیونکہ اس کا معاملہ اس کا معاملہ ہی نہیں بلکہ وہ تو میرا معاملہ ہوگیا ہے اس سے محبت کروگے تو مجھ سے محبت ہوگی اس سے دشمنی کروگے تو مجھ سے دشمنی ہوگی۔ وہ میرا بندہ ہے میں نے اپنے دین کے کام اپنی مخلوق کی بھلائی کے کام ان کی

رشد وہدایت کے کام جو کچھ اس کے سپرد کرنا چاہئے کر دیئے اور وہ کام اس بندہ نے اپنے ذمہ لے لئے تو وہ بندہ میرا ولی ہو گیا اور اس بندہ نے اپنے سارے کام میرے سپرد کر دیئے تو میں اس کا ولی ہو گیا۔

حضرت اویس قرنیؓ اور مقام ولایت

ایک شخص حضرت اویس قرنیؓ کے پاس زیارت کے لئے حاضر ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑیا آپ کی بھیڑوں اور بکریوں کی حفاظت کر رہا ہے اور آپ خود دریا کے کنارے ریت پر مصروف عبادت ہیں۔ وہ شخص یہ منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا وہ آپ کے پاس بیٹھ گیا جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بتاؤ کس کام سے آئے ہو۔ اس نے کہا کہ اپنا کام تو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس کا مفہوم سمجھائیں جو میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ آج تک تو سنتے آئے تھے کہ بھیڑیئے بکریوں کو چیر پھاڑ جاتے ہیں اور آج یہاں بھیڑیئے کو بکریوں کی حفاظت و نگہبانی کرتے دیکھا ہے یہ ماجرا کیا ہے؟

آپ نے فرمایا بات سادہ سی ہے کہ جو بندہ رب کے کام میں لگ جائے رب کی مخلوق اس کے کام میں لگ جاتی ہے میں اللہ کے کام میں مشغول ہو گیا اللہ نے اپنی مخلوق کو میرے کام پر لگا دیا۔ اگر میں نماز نہ پڑھ رہا ہوتا تو بکریوں کی حفاظت کرتا میں اس کی عبادت میں مشغول ہو گیا تو اس نے بھیڑیئے کو میری بکریوں کی حفاظت پر مامور فرما دیا۔

ہم اس مفہوم کی وضاحت کر رہے ہیں جس کے تحت ولی وہ ہوتا ہے جس کے معاملات اللہ کے سپرد ہو جائیں اور اللہ نے اپنے بندوں کے معاملات اس کے سپرد کر رکھے ہوں۔ اس لئے اللہ کے ولی کے پاس جانا ان سے تعلق ارادت قائم کرنا گویا اللہ کے غیر کے پاس جانا نہ ہوا بلکہ اللہ ہی کی بارگاہ کی طرف رجوع ہوا اور یہ جو مغالطہ پیدا کیا جاتا ہے کہ آپ اللہ کے ولیوں کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ اللہ کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ یہ مغالطے اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ولی اور ولایت کا مفہوم نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ وہ اللہ کے ولی ہیں اور اللہ ان کا ولی ہے انہوں نے اپنے سارے معاملات بھی

رب کے حوالے کر دیئے ہیں تو ان کی بارگاہ اللہ کے غیر کی بارگاہ بھی نہیں بلکہ وہ تو اللہ ہی کی بارگاہ ہے۔

اسی طرح ولی اللہ کا دوسرا مفہوم (جبکہ ولی ولایت واؤ کی زبر سے مشتق ہو جس کا معنی حکمرانی و بادشاہی ہے) یہ ہو گا کہ جب بندہ اللہ کا ولی بنتا ہے تو وہ اپنے بندے کو صاحب ولایت بنا دیتا ہے اور ولایت دینے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ رب العزت یہ اعلان کرتا ہے کہ لوگو! میں نے اس بندے کو تمہارا حکمران بنا دیا ہے میری طرف سے میرا یہ بندہ تمہارا بادشاہ بنا دیا گیا ہے۔ اب اگر حضرت ابراہیم بن ادھمؒ دریا کی مچھلیوں کو حکم دے گا کہ میری سوئی لے کر نکل آؤ تو مچھلیاں فوراً اسی حکم کی تعمیل پر نکل آئیں کیونکہ یہ مچھلیوں پر بھی حکمران ہے دریاؤں کی لہریں اور تمہارے دلوں کی سرزمین سب اس کی حکمرانی میں داخل ہیں۔

حضور غوث الثقلینؓ اور مقام ولایت

حضرت غوث الاعظم سید عبد القادر الجیلانیؒ کی مجلس وعظ میں ہزاروں کا مجمع ہوتا اور بغیر سپیکر کے آپ کی آواز تمام لوگوں تک برابر پہنچتی۔ جس طرح پہلی صف والے لوگ سنتے آخر میں بیٹھنے والے بھی اسی طرح آپ کی آواز سے مستفیض ہوتے۔ جب آپ باہر تشریف لاتے تو مجمع کھڑا ہو جاتا اور آپ کی زیارت کے لئے لوگوں کے جذبات قابل دید ہوتے اور ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا مگر ایک دن ایسے ہوا کہ آپ مجمع کو چیرتے مجمع کے درمیان آگئے اور آپ کے استقبال کے لئے ایک شخص بھی کھڑا نہ ہوا۔ کسی خادم نے دریافت کیا کہ حضور کیا بات ہے؟ تو آپ نے فرمایا لوگوں کے دلوں کی حکمرانی ہمارے پاس ہے ہم چاہیں تو اٹھنے دیں اور چاہیں تو نہ اٹھنے دیں۔ اس سے اتنی سی بات آہستہ سے کہی اور اچانک سارا مجمع اٹھ کھڑا ہوا۔ فرمایا نہ اٹھنے کا رنگ بھی دیکھ لیا اب اٹھنے کا رنگ بھی دیکھ لو۔

جب اللہ اپنے کسی بندے کو مقام ولایت عطا فرماتا ہے تو اسے خلق خدا ے

دلوں پر حکمرانی عطا فرماتا ہے اور یہ حکمرانی ہماری دنیا کی حکمرانی سے مختلف ہوتی ہے۔ دنیا حکمران جب تک کرسی پر رہتا ہے لوگ سلام کرتے ہیں اور جب کرسی سے ہٹ جاتا ہے تو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ہزارہا حکمران دنیا پر حکمرانی کرتے رہے مگر ان کا نام لینے والا کوئی نہیں۔ بلکہ ان کی حیات میں جب اقتدار و حکمرانی ان سے چھن گئی تو لوگوں نے ان کا چہرہ بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف اللہ کے ولی کی حکمرانی ہے کہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری" کو اس دنیا سے پردہ فرمائے بھی ساڑھے نو سو سال گزر گئے مگر آپ کے مزار پاک پر جا کر دیکھیں لوگوں کے دلوں پر آپ کی حکمرانی نظر آئے گی حضور غوث الاعظم" حضرت خواجہ خواجگان خواجہ اجمیری" ۔ حضور بابا فرید الدین گنج شکر اور دیگر بے شمار اولیاء کرام جن کو وصال فرمائے بھی صدیاں گزر گئیں۔ مگر ان کی حکمرانی جو اللہ نے انہیں انسانوں کے دلوں پر عطا کی وہ اب بھی قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گی۔

مفہوم ولایت حدیث قدسی کی روشنی میں

حضور غوث الثقلین غوث الاعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب سر الاسرار میں ولایت کا ماحصل اور نتیجہ یوں بیان فرمایا ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا کرے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

تخلقوا باخلاق اللّٰہ اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا کرو۔

اور بشری صفات کا لباس اتار کر صفات الٰہی کا لباس پہن لے۔ (سر الاسرار فیما یحتاج الیہ الابرار)

جب انسان بشری لباس اتار پھینکے اور اخلاق الٰہیہ کا لباس پہن لے۔ بشریت کا رنگ ختم کر کے اپنے آپ کو اللہ کے اوصاف اور اللہ کے اخلاق کے رنگ میں رنگ لے اور تخلقوا باخلاق اللّٰہ کا رنگ پوری طرح چڑھ جائے تو اسی کو ولایت کہتے ہیں۔ اس مقام کو ایک حدیث قدسی کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

لا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببته فکنت سمعه الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یبصر بہ و یدہ التی یبطش بھا و رجلہ التی یمشی بھا ولان سالنی لاعطینہ و لئن استعاذنی لا عیذنہ
(صحیح بخاری، ۲: ۹۶۳)

میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پس میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں (کی قوت) بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرے تو میں اس کے سوال کو ہر صورت پورا کروں گا اور اگر وہ میری پناہ طلب کرے تو میں یقیناً اسے پناہ دوں گا۔

اوصاف بشریت کا لبادہ اتار کر انسان جب اخلاق خداوندی کا جامہ زیب تن کرلیتا ہے تو سنتا انسان ہے مگر سننے کی قوت اللہ رب العزت کی ہوتی ہے دیکھتا بندہ ہے مگر دیکھنے کی قوت اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ پکڑتا بندہ ولی ہے مگر گرفت اللہ رب العزت کی ہوتی ہے بولتا انسان ہے مگر قوت گویائی اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ چلتا بندہ کامل ہے مگر پاؤں کی قوت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے گویا اس حدیث قدسی کی روشنی میں ولایت کا معنی یہ ہے کہ انسان قرب کی منزل طے کرتا ہوا اللہ کی بارگاہ میں اس طرح قرب حاصل کرلے کہ بندہ خدا کا ہو جائے اور خدا بندے کا ہو جائے۔ بندہ اللہ کا ولی ہو جائے اور اللہ اپنے بندے کا ولی بن جائے۔

قرب نوافل، قرب فرائض اور جمع بین القربین

• حضرت شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی اپنی کتاب "الانتباہ فی سلاسل اولیا" میں

قرب نوافل' قرب فرائض اور جمع بین القربین کے نام سے قرب خداوندی کی تین منازل میں ولی اللہ کے تین مختلف احوال کا ذکر فرماتے ہیں کہ قرب نوافل تو یہ ہے کہ بندہ کو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ تمام افعال کا فاعل بندہ ہوتا ہے جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا تعلق قرب بطور آلہ اس عمل وفعل کا ذریعہ ہوتا ہے جیساکہ حدیث قدسی میں **بی یسمع ' بی یبصر بی ینطق بی یبطش اور بی یمشی** کے الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ سننا' دیکھنا' بولنا' پکڑنا اور چلنا انسان کا فعل ہوتا ہے مگر ان تمام افعال کا محرک اور ذریعہ اللہ رب العزت کی ذات ہوتی ہے میں اسکے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے ان افعال کا فاعل انسان ہی ہوتا ہے اور ذرائع آلہ افعال واعمال خود خدا ہوتا ہے یہ قرب نوافل ہے اور اس سے ترقی کر کے جب انسان قرب فرائض کے مقام پر پہنچتا ہے تو حالت بدل جاتی ہے کہ یہاں بندہ صرف آلہ رہ جاتا ہے فاعل خود رب ذوالجلال ہوتا ہے۔ قرب نوافل میں فاعل خود بندہ تھا اللہ تعالیٰ کا تعلق اس فعل کا آلہ تھا مگر یہاں قرب فرائض کے مقام پر پہنچ کر انسانی عمل وفعل کا فاعل خود اللہ رب العزت ہو جاتا ہے اور انسان صرف آلہ اور ذریعہ رہ جاتا ہے قرب نوافل میں اللہ رب العزت نے فرمایا کہ میں کان بنتا ہوں سنتا بندہ ہے' میں زبان بنتا ہوں تو بولتا خود بندہ ہے مگر قرب فرائض میں ترتیت بدل جاتی ہے کہ سنتا میں ہوں کان بندے کے ہوتے ہیں۔ بولتا میں ہوں زبان بندے کی ہوتی ہے حضور ﷺ نے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے متعلق قرب فرائض کے مقام کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر و قلبہ	بیشک اللہ رب العزت نے (حق بات) کو حضرت عمر کی زبان پر اور ان کے دل میں رکھ دیا ہے۔

قرب فرائض یہ ہوا کہ زبان عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہوتی ہے اور بولتا اللہ رب

العزت ہے پھر ولایت ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ رب کی دوستی انسان کو اللہ کی بارگاہ کے قریب سے قریب تر کرتی چلی جاتی ہے۔ بشریت کا رنگ اترتا چلا جاتا ہے اور صفات الٰہیہ کا نیا رنگ چڑھتا چلا جاتا ہے اور یوں اس راہ پر ترقی کرتے کرتے قرب کا تیسرا درجہ جمع بین القربین آ جاتا ہے جہاں بندہ نہ غافل رہتا ہے اور نہ آلہ و ذریعہ بلکہ فاعل بھی اللہ رب العزت خود ہوتا ہے اور آلہ بھی وہ خود ہوتا ہے یہاں بندے کا اپنا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بس بندہ خالی بندہ ہی رہ جاتا ہے مگر اس میں ساری قوتیں رب کی کار فرما ہو جاتی ہیں گویا بندہ مقام محبوبیت کو پالیتا ہے اپنے ارادہ و فعل کو اللہ کے ارادہ و فعل میں گم اور فنا کر دیتا ہے تو یہ تیسرا درجہ جمع بین القربین کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

اب وجود تو انسان کا ہے مگر اس کی ساری قوتیں معدوم ہو گئیں اس کے ارادے نیتیں اور فاعلیت سب کچھ عدم ہو گئے اب فاعلیت بھی رب کی ہے، ارادہ بھی اسی کا ہے۔ نیت بھی اسی کی ہے اور فیصلہ بھی اسی کا ہے یہ بندہ تو ایک قسم کا پتلا ہے جدھر رب چلا رہا ہے چل رہا ہے بھیج رہا ہے جا رہا ہے وہ ہنسا رہا ہے تو ہنس رہا ہے وہ رلا رہا ہے تو رو رہا ہے اس کے ظاہر پر تصرف اللہ رب العزت کا ہے یہ مقام جمع بین القربین ہے اللہ رب العزت نے اپنے حبیب ﷺ کی ذات میں یہ تینوں قرب جمع فرما دیئے۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى

(الانفال، ۸:۱۷)

اور (اے رسول ﷺ) جس وقت آپ نے مٹھی بھر خاک دشمن پر پھینکی تھی، آپ نے نہ پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے تینوں مقامات کا ذکر فرمایا۔

وما رمیت اے محبوب ﷺ آپ نے کنکریاں نہیں پھینکیں۔ یہ قرب خداوندی ہے۔

اذ رمیت جب آپ نے پھینکیں تھیں۔ اس میں قرب نوافل کا بیان ہے ولکن اللہ رمی بلکہ وہ تو اللہ نے ماریں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ آلہ فعل رہے نہ فاعل رہے بلکہ فاعل بھی اللہ رب العزت اور آلہ فعل بھی وہ خود ہو گیا تو قرب کا یہ مقام جمع بین القربین ہے۔

لفظ تصوف کا چوتھا اور آخری حرف "فا" ہے ایک بندہ جب توبہ اور صفائے قلب وباطن کے جملہ مراحل طے کر کے ولایت کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے تو یہاں سے اس کی اعلیٰ منازل شروع ہو جاتی ہیں۔ "فا" سے تو بعض صوفیا نے فقیر بھی مراد لیا ہے لیکن حروف تصوف میں سیدنا غوث اعظمؒ نے فنائیت کا مقام مراد لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ ارفع و اعلیٰ مقام ہے جہاں ولایت تام ہوتی ہے۔ دیدار ذات یعنی مشاہدہ محبوب کے بعد حسن محبوب کے جلووں میں گم ہو جانا ہی بندگی کی معراج ہے۔ وہ اس مقام رفیع پر زمانی ومکانی حدود وقیود سے آزاد ہو کر حسن ازلی کے نشے میں مستغرق ہو گئے ہیں۔

چوتھا حرف "فا"

ف سے فنا کا تصور اہل صفا کی نظر میں

اللہ رب العزت کا یہ ارشاد گرامی کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ کم ہونے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی ہمیشہ رہنے والا ہے فنا وبقا کے تصورات کی اساس ہے۔ حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کشف المحجوب میں فنا کے مقامات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس جہاں کی ابتدا عدم سے ہوئی اور انتہاء عدم پر ہے اور جو ان دونوں صورتوں کے درمیان ہے وہی بقا ہے۔ بقا سے مراد دوام وابدیت وجود ہے وہ علم جو اس دنیا میں ہے فانی ہے اور باقی علم وہی ہے جو کہ عقبیٰ اور اُخروی زندگی پر دارومدار رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اہل ولایت بقا وفنا کے علم کو تصوف کا ایک درجہ کمال جانتے ہیں اور اسے اس مقام کے سوا اور کہیں استعمال نہیں

کرتے۔

اہل صفا مقام حال کے تغیرات سے رہائی اور مطلوب کو حاصل کرلینے کے بعد فنا کو پہنچتے ہیں اور وہ ہر اس محسوس شئے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں جو باصرہ اور سامعہ کے راستے ان پر وارد ہوتی ہے۔ فنائیت کے اس درجے میں وہ اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ خواہشات کا کانٹا بھی ان کے دل سے یکسر نکل جاتا ہے حتی کہ صادر ہونے والی کرامتیں بھی ان کے نزدیک حجاب بن جاتی ہیں۔ پھر اپنی خواہشات کی اپنے وجود سے نفی کرکے وہ اپنے اوصاف کو فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں اوصاف کا فنا کر دینا گویا بقائے دوام کا دروازہ ہے جس سے گزر کر ان کی فنا بقا کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور وہ قرب وبعد ہوش ومدہوشی، صحو وسکر فراق ووصال سب کیفیات سے بے خبر و بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

کم علم اور نادان لوگ اپنی کم فہمی کی بنا پر فنا کی حقیقت وماہیت سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے کہ فنا ایک ایسی صفت ہے جو بقا کو مستلزم ہے اور یہ دونوں صفتیں مل کر ہی مقام عبدیت کی تشکیل کرتی ہیں۔ فنا کا عین مراد لیا جانا امر محال ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ فنا میں مجاہدے کا عمل دخل ہوتا ہے۔ جب کہ بندہ صفاتی طور پر ماسوی اللہ سے فانی ہو جاتا ہے تو اس کے اوصاف ناسوتی فنا ہو جاتے ہیں اور اسے بقائے لاہوتی میسر آجاتی ہے اور وہ بقا کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جو بقاء الٰہی کا مظہر ہے جہاں پہنچ کر اس کے اوصاف بھی بقا کا رنگ اختیار کرلیتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ جو چیز کسی کے ساتھ ملی ہوگی تو وہ دونوں چیزیں فی الاصل ایک ہوں گی۔ فنا اور بقا دونوں ہماری صفتیں ہیں ہمارے اوصاف کی تحقیق میں فنا اور بقا دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن یہ کہنا روا ہوگا کہ فنا اور بقا یکسر جداگانہ صفتیں ہیں اس لئے کہ فنا سے ذکر غیر اور بقا سے ذکر حق مراد ہوگا وہ جو اپنے آپ سے فانی ہو جائے حق کے ساتھ باقی رہتا ہے فنا بندے کا اپنی عبودیت کے اعتبار سے فانی ہو جانا ہے اور بقا بندے کا حق پر باقی رہنا ہے اگر کوئی بندہ اپنے مقامات بندگی میں الجھ جائے اور اس کی بندگی اسے اپنی نگاہوں میں جچنے لگے تو وہ اپنے مقام بندگی کو کھونے لگتا ہے۔ بندہ اپنی بندگی کی حقیقت تک تب ہی پہنچتا ہے۔

جب اس کا عمل اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو جائے اور ہمہ وقت ذات حق کا مشاہدہ ہی اس کی نگاہ میں رہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بندے کے تمام اعمال وافعال اس کے اپنے ارادہ اور طاقت کی طرف منسوب کرنے کی بجائے ذات حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں۔ بندے کا ہر فعل ناقص اور فاعل حقیقی کا ہر فعل کامل ہوتا ہے چنانچہ جب بندہ غیراللہ کے تعلقات سے فانی ہو جاتا ہے تو وہ فنائیت سے آگے گزر کر بقائے دوام کی منزل کو پالیتا ہے۔

آخر میں یہ بات دھیان میں رہے کہ فنا وبقا کے سرچشمے اخلاص ووحدانیت سے پھوٹتے ہیں یہی عبودیت کی جان ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زندیقی ہے جب بندہ اپنے آپ کو بحکم حق مقہور اور ہر اعتبار سے مغلوب وعاجز تصور کرنے لگتا ہے تو عجز وانکسار اس کی سرشت میں شامل ہو جاتا ہے اور وہ فنا کی وادیوں سے گزر کر مملکت بقائے دوام میں جا نکلتا ہے جو شخص فنا کو عین فنا اور بقا کو عین حق سمجھتا ہے وہ حقیقی تصوف سے دور نصاریٰ اور زندقہ کے مذاہب پر عمل پیرا ہے جب بندے کے دل پر عظمت حق منکشف ہوتی ہے تو وہ اپنے دل سے دنیا وماسوا کا ہر تصور مٹا دیتا ہے اور تمام مقامات یہاں تک کہ کرامات کا ظہور بھی اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو جاتا ہے۔ فنا سے فنا ہو جانا گویا حق سے ہم کلام ہونا ہے جس میں جسم وجان اور قلب وروح سرتاپا عجز وفروتنی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

تصوف کا اصطلاحی مفہوم

گزشتہ سطور میں ہم نے مختلف حوالوں اور جہتوں سے تصوف کے مفاہیم ومعانی پر لغوی تناظر میں بحث کی ہے اب ہم اس کے اصطلاحی معنی ومفہوم کی طرف آتے ہیں۔ غور کیا جائے تو بیان کردہ لغوی معانی میں الفاظ کے اختلاف کے باوجود ایک قدر ظاہراً وباطناً مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ تصوف کا مقصود وماحصل قلب وباطن کی صفائی وطہارت سے عبارت ہو یا اللہ سے مخلصانہ دوستی اور محبت ومودت کا تعلق

قائم کرنے سے بارگاہ الوہیت میں عجزونیاز مندی اور تذلل کا اظہار ہو یا ادنی لباس کے پہناوے میں اللہ سے محبت پر مبنی تعلق میں یکسوئی پیدا کرنے سے عبارت ہو یا اصحاب صفہ کا طرز زندگی اپنانے سے یہ سارے کے سارے احوال و کیفیات ایک خاص جہت کی نشاندہی کر رہے ہیں جو زندگی کے ظاہر و باطن کو اس قدر منزہ اور پاک و صاف کرنے کی متقاضی ہے کہ جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی ادنی سے ادنیٰ نافرمانی تک کا شائبہ بھی باقی نہ رہے زندگی کا ظاہر بھی اللہ کی رضا کے تابع ہو جائے اور باطن بھی رذائل اخلاق معصیت و غفلت اور اثم وعدوان کے میل کچیل سے پاک صاف ہو جائے کہ انوار و تجلیات الٰہی کا مہبط بن جائے نتیجۃً دل اللہ کی محبت میں اس قدر یکسو اور مستغرق و منہمک ہو جائے کہ اس ذات سے دوستی و تعلق کی حلاوت میں نہ دنیا کی حرص خلل انداز ہو اور نہ آخرت کی طلب حاصل کلام یہ کہ ہر قسم کے لوث و غرض سے پاک اور کامل اخلاص پر مبنی طرز زیست کا نام تصوف ہے۔

حضرت مخدوم علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ نے کشف المحجوب میں شیخ محمد بن احمد المقریؒ کے حوالے سے تصوف کی اصطلاحی تعریف یوں بیان فرمائی۔

التصوف اقامۃ الاحوال مع الحق تصوف احوال کو حق کے ساتھ قائم رکھنے کا نام ہے۔ (کشف المحجوب: ۴۰)

تصوف اس طرز زندگی کا نام ہے جس میں بندہ غیر اللہ سے منہ موڑ کر اپنے معبود و محبوب حقیقی کے ساتھ بے لوث رشتہ قائم کر لیتا ہے نتیجۃً اس تعلق بندگی سے اسے وہ روحانی لذت و انبساط اور لطف و کیف نصیب ہوتا ہے جسے اقبال کی زبان حقیقت ترجمان نے اس طرح ادا کیا۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

جن خوش نصیب لوگوں کا محبوب حقیقی کے ساتھ تعلق آشنائی استوار ہو جاتا ہے انہیں اس تعلق کی حلاوت و کیفیت دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیتی ہے اور اس کے

صلے میں جو یک گونہ لذت و یکسوئی نصیب ہوتی ہے اس کے دوام کو تصوف کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اس کا صحیح ادراک وہی کر سکتے ہیں جو ان قلبی واردات و روحانی تجربات سے عملاً گزرتے ہیں۔ حق بات تو یہ ہے کہ تصوف سراسر حال سے عبارت ہے اور اس کی ماہیت و حقیقت کا ادراک محض قال سے ممکن نہیں۔

امام معروف کرخیؒ فرماتے ہیں۔

التصوف هو الاخذ بالحقائق واليأس مما في ايدي الخلائق	تصوف حقائق کو لینا اور مخلوق کے ہاتھوں میں جو کچھ ہے اس سے بے نیاز ہو جانے کا نام ہے۔
(حیوٰۃ الشیخ ارسلان الدمشقی: ۲۳)	

اگر تمسک بالحقائق اور استغنا عن الخلق انسان کا حال بن جائے تو اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ ان کیفیات عظمیٰ سے ہمکنار ہوتا ہے جو توحید کا نقطہ کمال ہیں۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

شیخ الاسلام زکریا انصاری فرماتے ہیں۔

التصوف هو علم تعرف به احوال تزكية النفوس و تصفية الاخلاق و تعمير الظاهر و الباطن لنيل السعادة الابدية	تصوف وہ علم ہے جس سے ابدی سعادت کے حصول کی غرض سے تزکیۂ نفس، تصفیۂ اخلاق اور تعمیر ظاہر و باطن کا طریقہ معلوم کیا جاتا ہے۔
(شرح الرسالۃ القشیریہ: ۷۰)	

یعنی تصوف انسان کی ابدی سعادتوں کی شاہ کلید ہے جو اس پر عظمتوں اور رفعتوں کے در وا کرتی چلی جاتی ہے۔

دل اگر اسی خاک میں زندہ و بیدار ہو
تری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ

شیخ ابوبکر بن اسحاق بخاریؒ فرماتے ہیں۔

قال بشر ابن الحارث الصوفی من صفا قلبہ للّٰہ (شرح التعرف فی مذہب التصوف: ۴۹)	بشر بن حارث کہتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جس کا قلب اللہ کے لئے صاف ہو جائے۔

یعنی جس کا دل ماسوا اللہ کے خیال تک سے پاک ہو جائے۔

ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولت قارون نے فکر افلاطون

اولیس معلوف ایسوعی یوں رقم طراز ہیں۔

الصوفی من کان فانیا بنفسہ باقیا باللہ تعالی مستخلصا من الطبائع متصلا بحقیقۃ الحقائق (المنجد تحت مادہ "صفا")	صوفی وہ ہے جو اپنے نفس میں فانی مگر اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق میں باقی ہو طبائع انسانی سے غیر متعلق اور ذات حقیقہ سے متصل ہو۔

سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا قول ہے۔

التصوف الصدق مع الحق و حسن الخلق مع الخلق (غنیتہ الطالبین)	تصوف حق کے ساتھ سچائی ہے اور مخلوق کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا ہے۔

صوفی کی تعریف آپ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

الصوفی من کان صافیا من آفات النفس خالیا من مذموماتها سالما لحمید مذاہب ملازما للحقائق غیر ساکن قلبہ الی احد من الخلائق (غنیتہ الطالبین)	صوفی وہ ہے جو آفات نفس سے پاک اس کے دفاع سے خالی اس کے اچھے راستوں پر چلنے والا اور حقائق سے متمسک ہو اور مخلوق میں سے کسی کے ساتھ دلی وابستگی نہ رکھے)

شیخ شہاب الدین سہروردی ؒ نے صوفی اور تصوف کی ایک ہزار سے زائد تعریفیں بیان کی ہیں جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ ان کے علاوہ متعدد ائمہ اور مشائخ نے جن میں معروف کرخی ؒ شیخ الاسلام زکریا انصاری ؒ شیخ محمد بن احمد المفری ؒ، شیخ ابوبکر بن اسحاق بخاری اور امام عبدالوہاب شعرانی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ تصوف اور صوفی کی تعریفیں بیان کی ہیں۔

المختصر تصوف اس طرز زندگی کا نام ہے جس میں تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعے معرفت ربانی کی تحصیل ہوتی ہے دوسرے لفظوں میں وہ طریق شریعت جس کے ذریعے تزکیۂ نفس اور صفائے باطن کے آداب واحوال معلوم ہوں اور معرفت الٰہی کا نور میسر آئے۔ تصوف کہلاتا ہے۔

تصوف وطریقت اور شریعت کے مابین کوئی تضاد نہیں

شریعت اور طریقت کے مابین تخالف وتضاد کا الزام محض سطح بینی کا نتیجہ ہے اگر بہ نظر عمیق دیکھا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ کمال شریعت کا نام ہی تصوف یا طریقت ہے خدا اور رسول کے احکام کا اتباع جب تک ظواہر تک محدود رہے اس کا نام شریعت ہے اور جب اس کے اثرات قلب وباطن پر مترتب ہونے لگیں اور باطن ان کی نورانیت سے منور ہونے لگے تو اسے فیضان تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً

جب کسی شخص نے کتب فقہ میں مندرج قواعد کے مطابق نماز پڑھ لی تو فقہا کے نزدیک اس کی نماز ہو جائے گی مگر اہل طریقت اسے کافی نہ سمجھیں گے بلکہ ان کا مسلک یہ تقاضا کرے گا کہ جس طرح چہرہ کعبہ کی جانب متوجہ رہا قلب بھی رب کعبہ کی جانب متوجہ رہے اور جیسے جسم حالت [illegible] از میں ظاہری نجاستوں اور آلائشوں سے پاک رہا، روح بھی باطنی آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک رہے گویا تصوف وطریقت شریعت کے مخالف ومحارب نہیں بلکہ عین اس کے منشا کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

تصوف کے ذریعے کسی انسان کا روحانی بلندیوں کو پالینا دراصل اس درجہ احسان پر فائز ہو جانا ہے جس کا ذکر اس متفق علیہ حدیث میں کیا گیا ہے جسے محدثین کرام حدیث جبریلؑ کے اسم سے موسوم کرتے ہیں اس حدیث میں مرد مومن کے تین درجات ایمان' اسلام اور احسان بیان کئے گئے ہیں۔

حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ عالیہ میں جب بصورت بشر حاضر ہوئے تو ایمان اور اسلام کے متعلق سوال کرنے کے بعد پوچھا۔

فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

(مشکوٰۃ المصابیح کتاب الایمان:۱۱)

پس (اے نبی ﷺ) مجھے احسان کے متعلق بتایئے فرمایا! یہ کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھتا ہے اور اگر تو اسے نہ دیکھ پائے تو کم از کم یہ کہ وہ تجھے دیکھتا ہے۔

پس کیفیت اول اخلاص فی العمل کا وہ درجۂ کمال ہے جہاں طالب فنا فی المطلوب ہو جاتا ہے اور کیفیت ثانی اس سے کمتر ہے ایمان اور اسلام عقیدہ و عمل سے عبارت ہیں' اس سے ماوراء وہ مقام ہے جسے مذکورہ حدیث میں اصطلاحاً "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے تصوف ہی کا دوسرا نام ہے اور یہی احسان شریعت کا ذروہ سنام ہے۔

باب دوم

تصوف کی اصطلاح کا پس منظر اور رواج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذشتہ باب میں ہم لفظ تصوف کے مختلف لغوی و اصطلاحی مفاہیم پر سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں اکابر علماء و صوفیائے کرام کے اقوال و فرمودات کے حوالے سے اسلام میں تصوف کی حقیقت اور اس کی اہمیت و افادیت پر بھی تفصیلاً روشنی ڈالی جا چکی ہے اس باب میں ہم تصوف اور صوفی کی اصطلاحات کے آغاز اور ترویج عام کا جائزہ لیں گے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عہد رسالتمآب ﷺ اور عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تک یہ دونوں اصطلاحات غیر مستعمل اور غیر مروج تھیں گو ان کا باقاعدہ استعمال دوسری صدی ہجری کے اوائل میں شروع ہوا تاہم اسی صدی کے اواخر تک یہ اصطلاحات معروف و متعارف ہو کر زبان زد خاص و عام ہو چکی تھیں ان کی اجنبیت ختم ہو چکی تھی اور عوام و خواص ان سے خوب اچھی طرح مانوس ہو چکے تھے۔

تصوف کے باب میں ایک عام مغالطہ

چونکہ دور نبوی ﷺ اور دور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں تصوف کی اصطلاح کا باقاعدہ وجود نہیں ملتا۔ اس لئے عصر حاضر کے بعض علمی حلقوں میں تصوف کے بارے میں ایک عام مغالطہ یہ پایا جاتا ہے کہ تصوف بنیادی طور پر عجم سے درآمد شدہ فلسفۂ روحانیت ہے اس کا اسلامی الاصل ہونا ثابت نہیں ہے۔ نیز تصوف کی تمام مصطلحات غیر اسلامی اور عجمی فکر و فلسفہ کی پیداوار ہیں بنابریں یہ حضرات بعض سطحی اور یک طرفہ مطالعہ کی بنا پر تصوف کو بدعت اور اسلام میں نووارد اجنبی فلسفہ خیال کرتے ہیں اور اسے ایک متوازی دین قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر بہ نظر غائر اسلام کی حقیقی تعلیمات اور اسلام کے انسانِ مطلوب کے معنوی و صوری حسن و جمال کے حصول کی منہاج کا کھوج لگایا جائے تو تصوف کے بارے میں مصلحت کی بنا پر پیدا شدہ یہ تصور یقیناً نقش بر آب ثابت ہوتا ہے اور اس کے عجمی یا غیر اسلامی فلسفہ ہونے کے الزام کی

سطحی اور غیر تحقیقی حیثیت بھی از خود واضح ہو جاتی ہے۔ یہ ایک بدیہی اور علمی طور پر تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ تفسیر حدیث اور فقہ سے متعلق ہزاروں اصطلاحات جو فی زمانہ مروج اور مستعمل ہیں اور جنہیں ہر دور کے اہل علم اور صاحبان فکر و نظر بلا تکلف استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں اکثر سے بیشتر دور مابعد نبوت کی پیداوار ہیں حتی کہ یہ اصطلاحات (اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو) عہد صحابہ بلکہ عہد تابعین تک علمی دنیا میں ناپید و غیر مروج نظر آتی ہیں۔ ان اصطلاحات کی ترتیب و تدوین دوسری اور تیسری صدی ہجری سے شروع ہو کر چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اسلامی علوم وفنون کی تدوین و تنقیح کا کام تدریجی بنیادوں پر ائمۂ امت اور ماہرین و محققین نے تسلسل سے جاری رکھا اور وقت کے ساتھ ساتھ علمی وفنی ضروریات کے تحت نئی نئی اصطلاحات معرض وجود میں آتی رہیں اور دامن علم بتدریج ان سے بھرتا گیا۔

اصطلاح کی حیثیت محض عنوان کی ہوتی ہے

ان اصطلاحات کے وضع کرنے میں کونسا مقصد کارفرما ہوتا ہے اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیۓ کہ اصطلاح کی حیثیت محض عنوان کی ہوتی ہے جس کا مقصد ایجاز و اختصار کے ساتھ ابلاغ موضوع کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے اصل مضمون کے مساوی یا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے اس حقیقت کو ایک تمثیل کے ذریعے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کوئی کتاب لکھنا شروع کرتا ہے تو وہ کتاب کے مندرجات اور شمولیت کو مد نظر رکھ کر اس کا ایک عنوان تجویز کرتا ہے جس کا مقصود فقط اس بات کا اظہار و بیان ہوتا ہے کہ کتاب فلاں موضوع پر ہے اور اس کے اندر زیر بحث آنے والے مضامین و مندرجات کا دائرۂ بحث یہ ہے گویا کتاب کے مندرجات (Contents) مباحث کتاب کی نشاندہی و نمائندگی کرتے ہیں۔ اور کتاب کا عنوان اس کے مندرجات پر دلالت کرتا ہے کتاب کے مضامین عنوان کتاب میں ایک قریبی

اور گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے بنابریں عنوان کا جدید یا قدیم ہونا یا وقتی ضرویات و مصالح کے تحت عنوان کا بدلتے رہنا یا کتاب کی تصنیف کے بعد عنوان کا تجویز کیا جانا فی نفسہ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ کتاب کا نفس مضمون یا اس کا مرکزی خیال جدید ہے یا قدیم بلکہ عین ممکن ہے کہ کتاب کا نفس مضمون اور مرکزی خیال تو صدیوں پرانا ہو لیکن مصنف نے قارئین کی سہولت آسانی اور بعض مصالح کی بنا پر نسبتاً جدید عنوان تجویز کر دیا ہو۔

جبکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ عنوانات و مصطلحات کے پس منظر میں پائے جانے والے مختلف افکار و نظریات اور تصورات کا تعلق وقت اور زمانے کے ساتھ ہے جو بجائے خود تسلسل سے عبارت ہے جو قدیم و جدید تمام زمانوں کو محیط ہے لہٰذا اگر کوئی تصور فی الواقعہ قدیم ہے تو اس پر دلالت کرنے والی اصطلاح کے قدیم یا جدید ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کی واقعیت و اصلیت ہرگز ہرگز محل نظر نہیں ٹھرتی اس حقیقت کو اقبال کی زبان حقیقت ترجمان یوں آشکار کرتی ہے۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

چنانچہ صاحبان عقل و دانش جب غواصی بحر کے لئے غوطہ زن ہوتے ہیں تو ان کا مطلوب و مقصود گہر ہوتا ہے نہ کہ صدف

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

اصطلاحات کی ناگزیر ضرورت

آیئے اب ہم مختلف علوم اسلامیہ کے حوالے سے اصطلاحات کی افادیت وناگزیریت اور قدیم و جدید ہونے کے تصور کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

قرآن کے معارف و مطالب اور مفاہیم بیان کرنے کو علم تفسیر کے نام سے

تعبیر کیا جاتا ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جب یہ علم ایک باقاعدہ فن کا درجہ اختیار کر گیا تو اس کی تفہیم کے لئے اصطلاحات کی ضرورت پیش آئی اور یہ اصطلاحات تدریجاً وضع ہوتی چلی گئیں اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ ان اصطلاحات کی حیثیت محض عنوان کی ہے اور یہ اپنی جگہ ایجاز واختصار کے اس اعجاز کی حامل ہیں کہ دریا بہ حباب اندر کی شان رکھتی ہیں۔ (گویا اصطلاحات عنوانات ہی کا دوسرا نام ہے) اب بنظر انصاف دیکھا جائے تو کیا دور بعد نبوت میں وقتاً فوقتاً تدریجی عمل کے نتیجے میں وضع ہونے والی ان اصطلاحات کو محض نیا ہونے کے اعتبار سے قرآنی علوم کے دائرے سے خارج کر دیا جائے گا اور ان کی افادیت واہمیت کو محض اس لئے محل نظر ٹھہرایا جائے گا کہ یہ دور نبوی ﷺ یا دور صحابہ میں مروج ومستعمل نہیں تھیں ہرگز نہیں اس لئے کہ اگر ایسا ممکن تسلیم کر لیا جائے تو پھر اسلام کے دامن میں کونسا علمی سرمایہ باقی رہ جائے گا جس کی صداقت وحقانیت پر فخر کیا جا سکے۔ فی الواقعہ یہ انداز فکر علم اور تاریخ علم پر ایک سنگین ظلم کے مترادف قرار پاتا ہے۔ یہی حال علم حدیث کا ہے محدثین نے حدیث کو رد وقبول کے مدارج کے اعتبار سے متعدد اقسام میں تقسیم کیا۔ پھر کسی کو ضعیف، کسی کو مرسل، کسی کو خبر واحد، کسی کو منفرد، کسی کو منقطع، کسی کو مرفوع اور کسی کو صحیح قرار دیا پھر اس کی مزید درجہ بندی کرتے ہوئے کسی کو صحیح لذاتہ، کسی کو حسن لذاتہ اور کسی کو حسن لغیرہ کے عنوان سے موسوم کیا۔ رد وقبول کے ان مختلف معیارات کے تعین پر مستزاد یہ کہ کتب حدیث کی بھی ان کے اسلوب ترتیب کی بنا پر جامع، سنن مسند اربعین اور دیگر اصطلاحات کے تحت درجہ بندی کی گئی اس طرح حدیث کے رد وقبول کے باب میں بیسیوں اصطلاحات وضع ہوئیں۔

پھر اسماء الرجال کا فن علم حدیث کا ایک مستقل موضوع ہے جس کی افادیت واہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ علوم حدیث کے فن میں جتنی بھی اصطلاحات فی زمانہ مروج ومستعمل ہیں عہد رسالت مآب ﷺ اور دور صحابہ میں ان کا کوئی وجود نہیں ملتا۔

یہ ایک تاریخی اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ایک عرصہ بعد جب علم حدیث ایک باقاعدہ فن اور سائنس کی صورت میں مدون و مرتب ہونا شروع ہوا تو یہ اصطلاحات ضرورت علمی کے تحت بتدریج وضع ہوتی چلی گئیں۔ علی ہذا القیاس علم فقہ جو سراسر قرآن وسنت پر مبنی علم ہے کی جملہ اصطلاحات جو آج مسائل شرعیہ کی تحقیق وتعین میں مستعمل و مروج ہیں حضور ﷺ اور صحابہ کے ادوار میں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ نہ قرآن میں ان کا کہیں ذکر ملتا ہے اور نہ حضور اکرم ﷺ نے کبھی ان اصطلاحات کے حوالے سے گفتگو فرمائی۔ ان اصطلاحات کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب فقہ اسلامی کو ایک مستقل علم وفن کی حیثیت سے مترتب و مدون کرنے کا مرحلہ درپیش آیا چنانچہ قرآنی آیات سے احکام و مسائل کا استنباط کرنے کے لئے کسی کو محکم، کسی کو مجمل اور کسی کو مفسر اور کسی کو متشابہ کہا جانے لگا اس طرح نظام عبادات کو علمی اصطلاحات کے تحت منظم کرنے کے لئے فرض، واجب، مستحب، مباح، مکروہ تنزیہی مکروہ تحریمی خلاف اولیٰ ایصار اور حرام جیسی اصطلاحات وضع ہوئیں۔ ان تمام اصطلاحات کا مقصد و مدعا سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ احکام و مسائل کو بغیر کسی اشتباہ والتباس کے کھول کھول کر بیان کر دیا جائے۔

حبکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی اصطلاح بھی فی نفسہ کبھی مقصود نہیں ہوا کرتی اصل مقصد نفس مضمون یا مفہوم کا ابلاغ (Communication) یعنی بات کو ذہن میں اچھی طرح راسخ کرنا ہوا کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا محض اصطلاحات کی اس جدت کی بنا پر قرآن وسنت سے ماخوذ اس پورے تشریعی نظام کو رد کر دیں گے؟ کوئی بھی سلیم الفکر اور صحیح الفہم شخص اس کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

تصوف قرآن وسنت پر مبنی ہے

مندرجہ بالا توضیحات کی بنا پر اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو یہ حقیقت کھل کر

سامنے آتی ہے کہ تصوف تزکیۂ نفس اور قلب وباطن کی صفا وجلا کا نام ہے جس کا خمیر علوم قرآن اور سنت نبوی سے اٹھا ہے ایک تصور فلسفہ روحانیت اور ضابطۂ زندگی کی حیثیت سے تصوف کا رشتہ عہد رسالت ﷺ اور عہد صحابہ سے استوار ہے بالفاظ دیگر روح تصوف اور اس کی عملی کیفیات حضور وسرور قلوب واذہان میں اسی دور باسعادت میں متموج تھیں اگرچہ تصوف صوفی اور اس نظام روحانیت سے متعلقہ دیگر اصطلاحات دیگر اسلامی علوم وفنون کی طرح وقت کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت وضع ہوتی چلی گئیں گذشتہ صفحات میں پیش کردہ استدلال کے پیش نظر محض اصطلاحات کے جدید ہونے کی بناپر کسی علم وفن کی مطلقاً نفی (Negation) کسی بھی صاحب علم اور سلیم الفطرت اور انصاف پسند شخص کو زیب نہیں دیتا۔ چنانچہ اصطلاحات کے حوالے سے تصوف کو ایک متوازی ذہن بدعت وضلالت یا عجمی فلسفہ وتصور قرار دینا یا تو سطح بینی کا کرشمہ ہو سکتا ہے یا پھر بقول متنبی

و کم من عائب قولا صحیحا

و آفتہ من الفہم السقیم

"اور کتنے ہی ایک صحیح بات سے عیب نکالنے والے ہوتے ہیں حالانکہ ساری آفت سقم زدہ فہم کی ہوتی ہے"۔

تصوف اور صوفی کی اصطلاحات کے رواج کا آغاز

تصوف اور صوفی کی اصطلاحات کو جیساکہ قبل ازیں اشارۃً ذکر کیا جا چکا ہے حضور نبی اکرم ﷺ کے وصال کے کم وبیش سو سال بعد دوسری صدی ہجری میں رواج پذیر ہوئیں تاہم اس کی شروحات' حدیث تفسیر اور فقہ کی اصطلاحات کے باقاعدہ رواج سے بہت پہلے ہو چکی تھیں۔ جبکہ ابھی تابعین اور تبع تابعین کا مبارک دور تھا۔ جسے حضور ﷺ نے خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم (صحیح بخاری' ۱: ۳۶۲) سے تعبیر فرمایا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں۔

واللہ تعالیٰ ذکر فی القران طوائف الخیر والصلاح فسمی قوما ابرارا واخرین مقربین و منهم الصابرون والصادقون والذاکرون والمحبون و اسم الصوفی مشتمل علی جمیع المتفرق فی هذه الاسماء المذکورة و هذا الاسم لم یکن فی زمن رسول اللہ ﷺ و قیل کان فی زمن التابعین	اللہ سبحانہ نے قرآن حکیم میں بھلائی اور اصلاح والے گروہوں کا تذکرہ کیا کسی کو ابرار کہا کسی کو مقربین کہا اور کسی کو صادقین کہا اور کسی کو ذاکرین کہا اور کسی کو محبین کے اسم سے نوازا اسم صوفی، ان تمام گروہوں پر منطبق ہوتا ہے جو ان اسما کے تحت مذکور ہیں۔ اور یہ اسم دور نبوی میں موجود نہ تھا تاہم یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اسم دور تابعین میں موجود تھا۔
و نقل عن الحسن[۱] البصری انہ قال	اور حضرت حسن بصریؒ (تابعی) سے

۱۔ حضرت حسن بصری رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین دور سے واصل ہیں۔ ابی عبد الرحمن السلمیؒ تہذیب الکمال کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

الحسن بن ابی الحسن واسمہ سیار البصری ابو سعید الامام احد ائمۃ الھدی والسنۃ رمی بالقدر و لم یصح ذلک و کان عالما جامعا رفیعا، ثقۃ ماموناعابدا ناسکا کثیر العلم فصیحا جمیلا و سیما من اشجع اھل زمانہ ولد سنۃ احدی و عشرین لسنتین بقیتا من خلافۃ عمر و مات فی رجب سنۃ عشرین و مائۃ (تہذیب الکمال: ۶۶) (طبقات الصوفیہ: ۲۵۲)

(الحسن بن ابی الحسن ان کا نام سیار بصری ہے کنیت ابو سعید اور ائمہ) ھدیٰ میں سے ایک امام ہیں۔ ان پر قدریہ ہونے کی تہمت لگائی گئی جو صحیح نہیں ہے۔ وہ عالم تھے۔ وہ جامع اور بلند مقام کے حامل تھے۔ ثقہ، مامون اور عابد تھے بہت صاحب علم اور فصیح تھے خوبصورت اور منفرد تھے۔ اپنے ہم عصر لوگوں میں بہت بہادر تھے۔ اکیس ہجری میں پیدا ہوئے جبکہ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال باقی تھے اور جب ایک سو بیس کو انتقال فرمایا

گویا آپ کی ولادت سیدنا حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ہوئی آپ نے خود حضرت علیؓ کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا اور تزکیہ نفس، تصفیہ باطن اور معرفت الہیہ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی وفات

رأیت صوفیا فی الطواف فاعطیتہ شیاء فلم یا خذ و قال معی اربع دوانیق یکفیھی مامعی اربع دوانیق یکفمنی ملامعی و یشھد ھذا ماروی عن سفیان انہ قال لو لا ابوھاشم الصوفی ماعرفت دقیق الریاء و ھذا یدل علی ان ھذا الاسم کان یعرف قدیما و قیل لم یعرف ھذا الاسم الی المائتین من الھجرۃ العربیۃ لان فی زمن رسول اللہ ﷺ

منقول ہے کہ میں نے ایک (صوفی) کو کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اور اسے کوئی چیز دی لیکن اس نے نہ لی۔ اور کہا میرے پاس چار دوانیق ہیں۔ اور یہ قول تائید کرتا ہے کہ اس بات کی جو سفیان ثوریؒ سے روایت کی گئی ہے کہ اگر شیخ ابوہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریاء کی باریکیوں کو نہ جان پاتا یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ دور قدیم میں اسم (صوفی) معروف تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہ اسم ہجرت نبوی کے بعد دو سو سال تک معروف نہ تھا کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں

۱۱۰ھ میں ہوئی گویا آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ پہلی صدی ہجری میں بسر ہوا اور آپ نے بڑے بڑے نامور صحابہ کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی صحبت فیض رساں سے فیض یاب ہوئے ایک روایت یہ ہے کہ حسن بصریؒ کی والدہ ماجدہ نبی اکرم ﷺ کے ازواج مطہرات کے گھروں میں کام کرتی تھیں اور ان کا گھر مسجد نبوی سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا جب وہ امہات المومنین کے گھروں میں آتیں تو اپنے بیٹے حسن بصری کو ساتھ لاتیں جب حسن بصری جو اس وقت بہت چھوٹے تھے رونے لگتے تو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ آپ کو گود میں لے کر پیار کرتیں اور اپنا دودھ بھی پلاتیں اس طرح حضرت حسن بصریؒ کو حضور کا رضائی بیٹا ہونے کا شرف بھی حاصل ہے آپ کو خلفائے راشدین حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی اقتداء میں نمازیں پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی آپ نے اپنی زندگی کے کئی سال مدینہ منورہ میں گزارے اور بعد میں آپ بصرہ منتقل ہو گئے گویا حسن بصری براہ راست دور صحابہ کے فیض یافتہ ہیں جبکہ حضور ﷺ کے براہ راست تربیت یافتہ صحابہؓ دین خالص کا فیض عام کر رہے تھے اس لئے آپ کا قول باعتبار روایت واجب التسلیم ہو جاتا ہے۔

كان اصحاب رسول الله ﷺ
يسمون الرجل صحابيا اشرف صحبة
رسول الله ﷺ و كون الاشارة
اليها اولى من كل اشارة و بعد
العراض عهد رسول الله ﷺ من
اخذ منهم العلم مسمى تابعيا ثم لما
تقادم زمان الرسالة و بعد عهد النبوة
و انقطع الوحي السماوي و
توارى النور المصطفوي و اختلفت
الآراء و تنوعت الانحاء و تفرد كل
ذي راي برايه و كدر شرب العلوم
شوب الاهوية و تزعزعت ابنية
المتقين و اضطربت عزائم الزاهدين
و غلبت الجهالات و كشف حجابها و
كثرت العادات و تملكت اربابها و
تزخرفت الدنيا و كثرت خطاياها
تفرد طائفة باعمال صالحة و احوال
سنية و صدق في العزيمة و قوة في
الدين و زهدوا في الدنيا و محبتها'
و اغتنموا العزلة والوحدة
واتخذوا لنفوسهم زوايا يجتمعون
فيها تارة و ينفردون اخرى' اسوة
باهل الصفة' تاركين للاسباب
متبتلين الى رب الارباب فائم لهم

آپ (ﷺ) کے صحابہ اس آدمی کو
صحابی کا نام دیتے جو آپ کی صحبت سے
مشرف ہوتا کیونکہ اس میں صحبت رسول
ﷺ کی طرف اشارہ تھا جو ہر اشارے
سے بہتر تھا اور عہد رسالت مآب ﷺ
کے بعد جس نے صحابہ سے علم حاصل کیا
اسے تابعی کا نام دیا گیا پھر جب عہد
رسالت اور آسمانی وحی کے منقطع ہونے
کو عرصہ گزر گیا اور نور مصطفوی
ﷺ پوشیدہ ہو گیا اور لوگوں کی آراء
مختلف ہو گئیں اور ہر صاحب رائے اپنی
رائے میں منفرد ہو گیا اور علمی فضا کو
نفسانی خواہشات نے مکدر کر دیا۔ متقین
کی بنیادیں ہل گئیں اور زاہدوں کے
عزائم متزلزل ہو گئے' جہالتوں کا غلبہ
ہونے لگا اور اس کے پردے دلوں پر
گہرے ہو گئے۔ عادات بگڑ گئیں اور
ارباب دنیا خرافات دنیا میں گھر گئے اور
خطاکاریوں میں مبتلا ہو گئے تو ایک گروہ
نیک اعمال اور روشن احوال اور
عزیمت میں صدق اور دین میں قوت
کے ساتھ الگ ہو گیا انہوں نے دنیا اور
اس کی محبت سے کنارہ کشی اختیار کی اور
عزلت و تنہائی کو غنیمت جانا اور انہوں

صالح الاعمال اسنی الاحوال و تهیأ لهم صفاء الفهوم بقول العلوم و صار لهم بعد اللسان لسان و بعد العرفان عرفان و بعد الایمان ایمان کما قال حارثة اصبحت مؤمنا حقا حیث کشف برتبة فی الایمان غیرها یتعاهدها فصار لهم بمقتضی ذالک علوم یعرفونها و اشارات یتعاهدونها' فخرروا لنفوسهم اصطلاحات تشیر الی معان یعرفونها و تعرب عن احوال یجدونها فاخذ ذالک الخلف عن السلف' حتی صار ذالک رسما مستمرا و خبرا مستقرا فی کل عصر و زمان مظهر هذا الاسم بینهم و تسموا و سموا به فالاسم سمتهم و العلم بالله صفتهم و العبادة حلیهم و التقوی شعارهم و حقائق الحقیقة اسرارهم نزاع القبائل و اصحاب الفضائل سکان قباب الغیرة و قطان دیار الحیرة لهم مع الساعات عن امداد فضل الله مزید و لهب شوقهم یتأجج و یقول هل من مزید۔ اللهم احشرنا فی زمرتهم

نے اپنے لئے الگ گوشے بنا لئے جہاں وہ کبھی جمع ہوتے اور پھر الگ ہو جاتے ان میں اصحاب صفہ کا نمونہ موجود تھا انہوں نے اسباب کو ترک کر دیا اور ہمہ تن اللہ تعالٰی کی طرف متوجہ ہو گئے تو ان کے نیک اعمال ان کے لئے روشن و منور احوال کا پھل لائے اور علوم الٰہیہ کے قبول کرنے کے لئے فہم کی صفائی مہیا کی اس طرح ان کو ظاہری زبان کے ساتھ ساتھ باطنی زبان اور عرفان حاصلہ کے بعد ایک اور عرفان اور ایمان ظاہری کے ساتھ ایمان باطنی سے بھی بہرہ ور ہو گئے جس طرح کہ حضرت حارثہ نے فرمایا کہ جب مجھے ایمان کے غیر معمولی مرتبہ کا کشف ہوا جو عام لوگوں میں نہیں پایا جاتا تو میں حقیقی اور صحیح معنوں میں مومن بن گیا بس جب ان علوم نے ان گوشہ نشینوں کو نئے علوم سے واقف کرایا تو انہوں نے ان علوم جدیدہ کے لئے اصطلاحات وضع کیں جو ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکیں اور ان کے وجدان و باطنی کیفیات کو ظاہر کر سکیں پھر اخلاف نے اپنے اسلاف سے اس کی

وارزقنا حالاتھم

(عوارف المعارف: ۲۰۴-۲۰۵)

تعلیمات حاصل کرنا شروع کیں اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہو گیا یہاں تک کہ زمانہ مابعد میں اس نے ایک باقاعدہ علم اور مستقل رسم کی صورت اختیار کر لی تو یہ اسم (صوفی) ان میں رائج ہو گیا اور یہ لوگ خود بھی اسی نام سے موسوم ہو گئے بس اس وقت سے یہ اسم ان کی نشانی ہے اور علم الٰہی ان کی صفت ہے عبادت الٰہی ان کا زیور ہے اور تقویٰ ان کا شعار اور حقیقت الہیہ کے حقائق ان کے اسرار ہیں یہ حضرات قبیلوں کو چھوڑ کر غیرت کے قبوں میں رہتے ہیں اور حیرت کی دنیا میں آباد ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے لحظہ بہ لحظہ ترقی کی طرف رواں ہیں اور محبت الٰہی کی آگ ان کے دل میں شعلہ زن ہے اور وہ پھر بھی تشنگی کے عالم میں ھل من مزید کا نعرہ، بلند کرتے ہیں۔ اے اللہ ہمارا حشر اسی گروہ کے ساتھ کرنا اور ان کے باطنی حالات کو نصیب فرما۔ آمین۔

یہ طویل اقتباس اصطلاح تصوف و(صوفی) کے آغاز و رواج کی بطریق احسن وضاحت کرتا ہے اور اصحاب صوفیاء کے ہوس، نفس پرستی قلبی و ذہنی آلودگیوں استخوان گیری دمغز اگنی کے دور میں عشق الٰہی اور خالص دین کی شمعیں جلانے کی

دلیل ناطق ہے اور ان اصطلاحات کے مدلولات کا بے مثال بیان ہے اس اقتباس پر جس قدر غور و فکر کیا جائے اہل تصوف بطور فلسفہ روحانیت عبادات و ریاضات کا مقصد مدعا ٹھہرتا ہے۔

شیخ ابو نصر سراج نے کتاب اللمع میں لکھا ہے کہ

ان هذا الاسم ليس بمحدث لان الحسن البصری الذی ادرک جماعة من الصحبة رای صوفیا یطوف بالکعبه (الشیخ ارسلان دمشقی: ۲۵)	بے شک یہ اسم (صوفی) نیا نہیں ہے کیونکہ حسن بصری نے جنہوں نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا۔ ایک صوفی کو کعبہ کے طواف میں مشغول دیکھا۔

لفظ صوفی کا بے ساختگی سے یہ استعمال اس حقیقت کا غماز ہے کہ حضرت حسن بصری" کے زمانے میں کسی کو (صوفی) کے نام سے پکارنے کا رواج اس قدر عام تھا کہ لوگ اس اصطلاح سے بخوبی آشنا اور مانوس ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے کمال بے تکلفی سے اس اصطلاح کی تفصیل میں جائے بغیر کہہ دیا کہ میں نے ایک صوفی کو کعبے کا طواف کرتے ہوئے دیکھا ظاہر ہے کہ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے کہ جس کو تیقن ہو کہ جو کچھ وہ کہے گا اس کا سامع بلا تامل سمجھ لے گا۔

حضرت امام سفیان ثوری" اور شیخ ابو الہاشم صوفی اور پہلی خانقاہ

اسی دور میں ایک اور صاحب حال بزرگ ہوئے جو امام ابو حنیفہ" کے استاد بھی ہیں اور شاگرد بھی۔ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے متقی، پرہیزگار محدث، مورخ اور جلیل القدر امام سفیان ثوری" ہیں۔ آپ کا شمار ممتاز تابعین میں ہوتا ہے۔ ابو عبدالرحمن السلمی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

سفیان بن سعید بن مسروق بن حبیب بن رافع، الثوری: من ثور عبد مناة وقیل بل من ثور همدان ابو عبد الله الکوفی، احد الائمه	سفیان بن سعید بن مسروق بن حبیب رافع ثوری آپ عبد مناۃ کے قبیلہ ثور سے ہیں اور کہا گیا کہ آپ ہمدان کے قبیلہ ثور سے آپ ابو عبد اللہ الکوفی، ان

الاعلام کان لا یستمع شیئاً الا حفظہ

ائمہ میں سے ہیں جو علم کا سمندر تھے اور آپ کوئی بات نہ سنتے تھے مگر یہ کہ آپ کو حفظ ہو جاتی۔

یقول الخطیب: کان الثوری اماما من ائمۃ المسلمین و علما من اعلام الدین مجمعا علی امامتہ مع الاتقان والضبط والحفظ والمعرفۃ' توفی بالبصرۃ سنۃ احدی و ستین و مائۃ و مولدہ سنۃ سبع و سبعین

(طبقات الصوفیہ: ۲۷) (تذہیب الکمال: ۱۲۳)

خطیب کہتا ہے۔ امام ثوری ائمہ مسلمین میں بڑے جلیل القدر امام تھے اور دین مبین کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ آپ کی امامت پختگی 'ضبط' حفظ اور معرفت پر سب متفق ہیں ۱۶۱ھ میں بصرہ میں آپ کا انتقال ہوا اور ۷۷ھ میں آپ پیدا ہوئے۔

مولانا عبد الرحمن جامی نے حضرت سفیان ثوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ

حضرت ابوہاشم الصوفی بکنیت مشہور است شیخ بودہ بشام و دراصل کوفیست و باسفیان الثوری" بالبصرۃ سنہ احدی و ستین و ماۃ و سفیان ثوری گوید لو لا ابوالہاشم الصوفی ما عرفت دقیق الریاء قعد الریاء وہم وی گوید

حضرت ابوہاشم الصوفی اپنی کنیت سے مشہور ہیں۔ شام میں آپ بہت بڑے شیخ کامل تھے اور اصل میں آپ کوفی ہیں۔ ۱۶۱ھ میں بصرہ حضرت سفیان ثوری کے ساتھ تھے۔ حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اگر ابوہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریاکاری کی باریک باتوں سے واقف نہ ہوتا۔

من ندانستم کہ صوفی چہ بود تا ابوالہاشم صوفی راندیدم و پیش ازوی بزرگان بود ندور زہد ورع و معاملات نیکو در طریق توکل و طریق محبت لیکن اول کسیکہ وی

حضرت سفیان ثوری" یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب تک میں نے شیخ ابوالہاشم کو نہیں دیکھا تھا مجھے پتہ نہ تھا کہ صوفی کیسے ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ آپ سے پہلے

راصوفی خواندوی بود وپیش ازوی کسے رابایں نام نخوانده بود ہمچنیں اول خانقاہی کہ برای صوفیاں بنا کردند آنست کہ برملہ شام کردند و سبب آن بود کہ روزی امیری ترسائی بشکار رفتہ بود در راہ دوتن رادید ازیں طائفہ کہ فراہم رسید ندودست در آغوش یکدیگر کردند وہم آنجا بنشتند وآنچہ داشتند از خوردنی پیش نہادند و بخوردند آنگاہ برفتند امیر ترسارا معاملہ و الفت ایشاں بایکدیگر خوش آمد یکے ازیشاں رابخواند وپرسید کہ آن کہ بود گفت ندانم گفت تراچہ بود گفت ہیچ چیز گفت از کجا بود گفت ندانم آں امیر گفت پس ایں الفت چہ بود کہ شمار بایکدیگر بود درویش گفت کہ ایں مارا طریقت گفت شمارا جای ہست کہ آنجا فراہم آئید گفت نی گفت من برائے شما جائے بسازم تا بایکدگر آنجا فراہم آئید پس آنجا خانقاہ برملہ بساخت

(نفحات الانس: ۲۲، ترجمہ: ۱۷۷)

ایسے بہت سے بزرگ گزرے ہیں جو زہد و تقویٰ، توکل اور محبت اور معاملات میں باکمال اصحاب تھے لیکن یہ انفرادیت اور وصف آپ ہی کے ساتھ خاص ہیں آپ کو صوفی کہا گیا۔ آپ سے قبل کسی شخص کو اس نام سے نہیں پکارا گیا اسی طرح سب سے پہلے صوفیوں کے لئے آپ ہی نے رملہ (شام) میں پہلی خانقاہ قائم کی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ایک دن ایک امیر جو آتش پرست تھا شکار کے لئے باہر گیا ہوا تھا راستے میں اس نے دیکھا کہ دو شخص ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور اسی جگہ بیٹھ گئے اور جو کچھ ان کے پاس زاد راہ تھا وہ نکالا اور باہم کھانے لگے اور پھر روانہ ہو گئے امیر کو ان کا یہ باہمی خلوص اور دوستانہ بہت پسند آیا تو اس نے ان میں سے ایک سے پوچھا تمہارا دوسرا ساتھی کون تھا اس نے کہا میں نہیں جانتا۔ کیا تجھے اس سے کوئی کام تھا۔ امیر نے کہا نہیں پھر امیر نے پوچھا کہ وہ کدھر سے آرہا تھا اس نے کہا مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ امیر نے کہا۔ پھر تمہارے درمیان یہ محبت

اور خلوص کیسا اس درویش نے کہا ہمارا
طریقہ یہی ہے امیر نے دریافت کیا تمہارا
کوئی ٹھکانا ہے جہاں تم ایک دوسرے
سے ملاقات کرتے ہو۔ درویش نے
جواب دیا ہمارے پاس کوئی ایسی جگہ
نہیں ہے امیر نے کہا میں تمہارے لئے
ایک مکان تعمیر کروا دیتا ہوں جہاں تم
ایک دوسرے سے مل سکو پس امیر نے
ایک خانقاہ رملہ (شام) میں تعمیر کرا دی۔

گویا سفیان ثوری جیسے بزرگ بھی اقرار کرتے ہیں کہ اگر شیخ ابوالہاشم صوفی جیسے عارف کامل نہ ہوتے تو ریاکاری کے بارے میں بہت سی باریک اور پیچیدہ باتوں کو ہم نہ جان پاتے اور ان کے عرفان سے محروم رہتے یعنی یہ پتہ ہی نہ چلتا کہ کیا کیا افعال خفیفہ اور خواطر قلب ہیں جن سے ریاکاری فکر و عمل میں در آتی ہے ان معرفتوں کا علم کتابوں کے ذریعے نہیں بلکہ شیخ ابوالہاشم صوفی کی معرفت اور فیض صحبت سے حاصل ہوا گویا امام سفیان ثوری وہ پہلے بزرگ تھے جنہوں نے شیخ ابوالہاشم کو صوفی کے لقب سے پکارا پیشتر مذکور ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ جلیل القدر تابعی تھے آپ کی وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی۔ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بڑے بڑے علماء اور محدثین' صوفی کے لقب سے پکارے جانے لگے تھے جیسا کہ نفحات الانس کے طویل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔

موصوف شیخ ابوالہاشم نے رملہ کے مقام پر باقاعدہ روحانی تربیت کے لئے پہلی خانقاہ تعمیر کروائی تھی یہ گویا نبی اکرم ﷺ کی اسی سنت کی پیروی تھی کہ آپ کے زمانہ اقدس میں مسجد نبوی سے متصل صفہ کی خانقاہ صوفیاء صحابہ کی پہلی تربیت گاہ تھی جس کے معلم خود سرکار دو جہاں ﷺ تھے۔

تصوف اور شریعت سے متعلق امام مالک کا فتویٰ

اسی دور باسعادت کے ایک نامور بزرگ امام مالک" بھی ہیں جو نابغہ روزگار' برگزیدہ' امام و مجتہد فقہ مالکی کے بانی ہیں۔ آپ کا سال پیدائش باختلاف روایت ۹۳ھ' ۹۴ھ' ۹۵ھ بتایا جاتا ہے اور سال وفات ۱۷۹ھ ہے۔ امام مالک" نے اگرچہ زیادہ زمانہ تبع تابعین کا پایا لیکن اکتساب فیض تابعین سے کیا۔ امام موصوف کا یہ قول مشہور عام ہے کہ

من تفقه و لم يتصوف فقد تفسق و من تصوف و لم يتفقه فقد تزندق و من جمع بينهما فقد تحقق

(مرقاۃ المفاتیح ۱۰: ۲۵۶)

جو فقہ میں ماہر ہوا اور تصوف سے نابلد رہا۔ یقیناً فسق کا مرتکب ہوا اور جو تصوف میں ڈوب گیا اور فقہ سے بے بہرہ رہا وہ زندیق ہو گیا اور جس نے (فقہ و تصوف) دونوں کو اپنے اندر جمع کر لیا وہ حقیقت کو پا گیا۔

امام مالک" کے فرمان کی رو سے جس نے فقہ کے ظاہری علم کو اپنایا لیکن تصوف کو نظرانداز کر کے اس جذبہ و محرک (incentive) سے محروم رہا جو محبت الٰہی ہے اور عمل اور پھر اخلاص فی العمل کا سبب ہے وہ فسق و فجور کی راہ پر چل نکلا اس کے برعکس جس نے تصوف کو اپنایا لیکن شریعت کے ظاہری احکام کو پس پشت ڈال دیا۔ وہ ملحد و زندیق ہو گیا اور ایمان و عمل دونوں سے محروم ہو گیا لیکن جس خوش نصیب نے فقہ و تصوف دونوں کو اپنی ذات میں جمع کیا یعنی شریعت کے ظاہری آداب کی بجا آوری کے ساتھ طریقت کے باطنی آداب بھی بجا لایا اس نے حق پا لیا دراصل علم فقہ و علم طریقت کو ایک ساتھ دامن میں سمیٹنے والا ہی جادۂ حق کا رہرو اور واصل الی المطلوب ہے اور جس نے دونوں میں تفریق روا رکھی اور صرف ایک کو اختیار کیا وہ گویا صراط مستقیم سے بھٹک گیا۔

امام مالک کا یہ ارشاد بڑی صراحت کے ساتھ تصوف کی اہمیت' اصلیت اور

مفہوم و معنی کی وضاحت کر رہا ہے اور اس قول سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تصوف کی یہ تمام اصطلاحات دوسری صدی ہجری میں مروج اور مستعمل تھیں اور اہل علم بلا تامل اپنی گفتگو اور تصنیفات میں ان کا استعمال کرتے تھے دور ائمہ کے آغاز سے پہلے ہی اہل علم تصوف کی حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے اور یہ سب اصطلاحات ان کے لئے مطلقاً اجنبی (Alien) نہ رہی تھیں۔

تصوف کے بارے میں مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی تحقیق:

مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے تصوف کے بارے میں اپنی کتاب تصوف اسلام میں جامع بحث کی ہے وہ اخبار مکہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ یہ لفظ صوفی عہد اسلام سے پیشتر بھی رائج تھا اور عابد و برگزیدہ اشخاص کے لئے مستعمل تھا۔ بہ مقام دیگر رقم طراز ہیں " مسلمانوں میں ابتدا سے ایک گروہ ایسا موجود ہے جس نے تمام مقاصد دنیوی سے قطع نظر کر کے اپنا نصب العین محض یاد خدا و ذکر الٰہی کو رکھا اور صدق و صفا' سلوک و احسان کے مختلف طریقوں پر عامل رہا شروع شروع میں یہ گروہ دوسرے ناموں سے ملقب رہا ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد رفتہ رفتہ اس کے مسلک کا نام مسلک تصوف پڑ گیا اور یہ گروہ "گروہ صوفیا" کہلانے لگا۔ (تصوف اسلام: ۴)

آگے چل کر رقمطراز ہیں۔

"یہاں کہنا صرف یہ ہے کہ اس گروہ کے اکابر قدیم پہلے سب مسلمان تھے' پھر صوفی' وہ تصوف کو اسلام کے مقابل ایک جداگانہ مسلک کی حیثیت سے نہیں لاتے تھے' بلکہ اسلام کے ماتحت اسی کی پاکیزہ ترین صورت کو (تصوف) کہتے تھے۔ وہ اپنے اسلام کو اپنے تصوف پر مقدم رکھتے تھے اور تصوف کو محض اس لئے عزیز رکھتے تھے کہ وہ ان کے نزدیک اسلام کی خالص ترین و پاکیزہ ترین تعبیر تھی"۔

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں۔

"ان حضرات کے نزدیک تصوف کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباع کتاب و سنت میں انتہائی سعی کی جائے۔ اسوۂ رسول ﷺ و صحابہ کرام کو دلیل راہ رکھا جائے' اوامر

اسی کی تعمیل کی جائے طاعات و عبادات کو مقصود حیات سمجھا جائے قلب کو محبت و تعلق ماسوا سے الگ کیا جائے۔ نفس کو خشیت الٰہی سے مغلوب کیا جائے اور صفائے معاملات و تزکیہ باطن میں جد وجہد وسعی کا کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ ہونے پائے"۔

(تصوف اسلام: ۴-۵)

آپ کتاب اللمع کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں۔

منکرین تصوف ایک گروہ کہتا ہے قرآن اور احادیث نبوی کے سارے دفتر میں نہ کہیں تصوف کا ذکر آیا ہے نہ کہیں گروہ صوفیاء کا۔ اس لئے اس مسلک کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ لیکن حضرت مصنف جس تصوف کے قائل ہیں اس کے تذکرہ سے تو کلام مجید بھرا پڑا ہے' فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایسے الفاظ و عبارات بہ کثرت آئے ہیں جن سے مراد اہل تصوف ہی ہیں۔ مثلاً صادقین و صادقات' قانتین و قانتات' خاشعین' موقنین' مخلصین' محسنین' خائفین' عابدین' ذاکرین' صابرین' راضین' متوکلین' مجبین' اولیاء' مصطفین' ابرار' مقربین' صادقین' مقتصدین' سارعین الی الخیرات' مشاہدین (مثلاً اس آیت میں اوالقی السمع وھو شھید) اور مطمئنین (مثلاً اس آیت میں (الا بذکر اللہ تطمئن القلوب)

حقیقت یہ ہے کہ تصوف روح دین ہونے کے ناطے قرآن حکیم میں معناً جابجا مذکور ہے جبکہ علمی سطح پر دیگر اصطلاحات کی طرح روحانی نظام کے لئے تصوف کی اصطلاح بعد میں رائج ہوئی۔

تربیت گاہ مصطفوی سے فیض یافتہ: اصحاب صفہ

شیخ احمد رفاعیؒ بنو صوفہ اور اصحاب صفہ کو ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

الفقیر علی الطریق ما دام علی السنۃ	فقیر صحیح راستے پر ہے جب تک سنت پر
فمتی حاد عنھا زل عن الطریق قیل	رہے اور جب اس سے منحرف ہو جائے
لھذہ الطائفۃ الصوفیۃ: و اختلف	تو راستے سے بھٹک گیا۔ اس گروہ کو

الناس فی سبب التسمیہ و سببها غریب لا یعرفہ الکثیر من الفقراء و هو ان جماعۃ من مضر یقال لهم بنو الصوفۃ و هو الغوث بن مر بن اد بن طابخۃ الربیط کانت امہ لا یعیش لها الولد فنذرت ان عاش لها ولد لتربطن برأسہ صوفۃ و تجعلہ ربیط الکعبۃ و قد کانوا یجیزون الحاج الی ان من اللہ بظهور الاسلام فاسلموا و کانوا عبادا و نقل عن بعضهم حدیث رسول اللہ ﷺ فمن صحبهم سمی بالصوفی و کذالک من صحب من صحبهم

(البرہان المؤید: ۲۹-۳۰)

صوفیہ کہا گیا ان کی وجہ تسمیہ میں لوگوں کا اختلاف ہے اور سبب اس کا عجیب ہے جسے اکثر فقرا نہیں سمجھتے اور وہ یہ کہ قبیلہ مضر میں سے ایک جماعت تھی جنہیں بنو صوفہ کہا جاتا تھا اور وہ تھا غوث بن مر بن اد بن طابخہ الربیط۔ اس کی ماں کا کوئی بیٹا زندہ نہ رہتا تھا۔ پس اس نے نذر مانی کہ اگر اس کا کوئی بیٹا زندہ رہا تو وہ اس کے سر پر صوفہ (عمامہ) باندھے گی اور اسے کعبہ کے لئے وقف کرے گی اور پھر یہ جماعت حجاج کی خدمت میں انعامات پیش کرے۔ تاآنکہ اللہ تعالی نے ظہور اسلام کا احسان فرمایا۔ اور وہ لوگ اسلام لا کر عبادت گزار بن گئے۔ بعض نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ جو ان کی صحبت میں رہے صوفی کہلانے لگے اور اسی طرح جو صوفی کہلانے والوں کی صحبت میں رہے وہ بھی صوفی کہلانے لگے۔

گویا بنو صوفہ سے اکتساب فیض کرنے والے ہر بزرگ کو صوفی کہا جانے لگا تھا

"اخبار مکہ" اور "البرہان المؤید" کے ان ہر دو حوالوں میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ رحمت عالم ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد جب یہ لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تو انہی بنو صوفہ میں سے وہ لوگ جو حضور کی غلامی سے مشرف ہوئے انہیں مسجد نبوی کے

چبوترے (صفہ) پر رسول اکرم ﷺ سے براہ راست فیض و تربیت پانے کا موقع ملا اور وہ اصحاب صفہ کے معزز لقب سے ملقب ہوئے۔ رحمت اسلام کو اپنے دامن میں سمیٹنے سے پہلے یہ کلی الاصل لوگ پیشہ تجارت یا کسی اور روزگار سے منسلک نہ ہونے کی وجہ سے زمرہ غربا و فقراء میں سے تھے ہجرت کے بعد یہ مدینہ چلے آئے اور ان میں سے اکثر و بیشتر حضور ﷺ کے غلاموں کے زمرے میں شامل ہو کر شب و روز تربیت و صحبت مصطفوی سے فیض یاب ہونے لگے ان درویش صفت' پرہیزگار اور متقی لوگوں نے جن کا کوئی باقاعدہ ذریعہ معاش نہ تھا اپنی زندگیاں کلیتہ دین کے لئے وقف کر دیں اور اسلام کی اولین تربیت گاہ میں براہ راست معلم انسانیت کی نظر کیمیا اثر کی بدولت ظاہری اور باطنی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہوئے۔

اصحاب صفہ پر قرآن کی نظر

انہی اصحاب صفہ کے بارے میں قرآن حکیم میں متعدد آیات وارد ہوئیں مثلاً

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (البقرہ' ۲:۲۷۳)

خیرات ان فقراء کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں رکے ہوئے ہیں وہ زمین پر چل پھر نہیں سکتے (کسب معاش کے لئے) ناواقف ان کو سوال نہ کرنے کے باعث تونگر اور دولتمند سمجھتے ہیں (حالانکہ ان کا دست سوال دراز نہ کرنا ان کے زہد اور خلق سے لاپرواہی کے باعث ہے) تم ان کو ان کے چہرے سے پہچان لیتے ہو وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔

علامہ ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے یہ حدیث نقل کی ہے۔

اخرج ابن المنذر عن ابن عباس هم ابن المنذر نے ابن عباس سے روایت

اهل الصفة كانوا نحوا من اربع مائة رجل من فقراء المهاجرين لم يكن لهم مساكن في المدينة و لا عشائر يسكنون صفة المسجد يستغرقون اوقاتهم بالتعلم والعبادة و كانوا يخرجون في كل سرية يبعثها رسول الله ﷺ

(التفسیر المظہری‘ ۱:۳۹۲)

کیا کہ اہل صفہ تقریباً چار سو افراد تھے جو فقراء مہاجرین میں سے تھے مدینہ طیبہ میں ان کے پاس نہ تو رہنے کی جگہ تھی نہ وہاں ان کا قبیلہ تھا۔ وہ مسجد نبوی کے چبوترے میں رہتے تھے اور ہمہ وقت تعلیم حاصل کرتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے اور ہر لشکر کے ساتھ جہاد کے لئے نکلتے تھے جسے رسول اللہ بھیجتے۔

یہ آیت جہاں اصحاب صفہ کی شان فقر کو آشکار کرتی ہے وہاں روحانیت کے اثرات انسانی شخصیت پر عملی صورت میں بھی پیش کرتی ہے۔

ان غریب مفلوک الحال اور عبادت گزار بزرگ صحابہ کا ذکر قرآن حکیم میں دوسرے مقام پر یوں ہوا۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ

(الکہف‘ ۱۸:۲۸)

اور اپنے آپ کو روکے رکھیں ان لوگوں کے ساتھ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے رہتے ہیں اور صرف اسی کے مکھڑے کے طلبگار ہیں۔

صاحب الفتوحات الالہیہ اس آیت کے شان نزول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

و قيل نزلت هذه الاية في اصحاب الصفه و كانوا سبعمائة رجل فقراء في مسجد رسول الله ﷺ لا يخرجون الى تجارة و لا زرع و

اور کہا گیا ہے کہ یہ آیت اصحاب صفہ کے بارے میں نازل ہوئی اور وہ سات سو افراد تھے جو مسجد نبوی شریف میں رہنے والے فقراء تھے وہ نہ تو تجارت

ضرع یصلون صلوۃ و ینتظرون اخری فلما نزلت ھذہ الایۃ قال النبی الحمد للہ الذی جعل فی امتی من ان اصبر نفسی معھم

(الفتوحات الالٰہیہ: ۲۰)

کے لئے نکلتے اور ہی کھیتی باڑی کرتے وہ ایک نماز ادا کرتے اور پھر دوسری نماز کے منتظر رہتے پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا تمام تعریفیں اللہ رب العزت کے لئے ہیں جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ میں اپنے آپ کو ان کے ساتھ رکھوں۔

علامہ ابن کثیر اس آیت کا شان نزول ایک حدیث کے حوالے سے بیان کرتے ہیں جس سے ضمناً اصحاب صفہ کی ایک تصویر کھنچ جاتی ہے۔

عن عبد الرحمن بن سھل بن حنیف قال نزلت علی رسول اللہ ﷺ و ھو فی بعض ابیاتہ (واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغدٰوۃ والعشی یریدون وجھہ)

حضرت عبد الرحمٰن بن سہل بن حنیف سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ پر آیت (واصبر نفسک) نازل ہوئی جب آپ اپنے گھروں میں سے کسی گھر میں تشریف فرما تھے۔

فخرج یلتمسھم فوجد قوما یذکرون اللّٰہ تعالیٰ منھم ثائر الراس و جاف الجلد و ذوالثوب الواحد فلما راھم جلس معھم و قال الحمد للہ الذی جعل فی امتی من امرنی ان اصبر نفسی معھم

(تفسیر ابن کثیر ۳:۸۱)

تو آپ ان کی تلاش میں باہر تشریف لائے۔ پس آپ نے ایسے لوگوں کو پایا جو اللہ رب العزت کے ذکر میں محو تھے ان کے سر کے بال پراگندہ تھے جلدیں خشک تھیں اور ایک ہی کپڑا پہنے ہوئے تھے پس جب آپ نے انہیں دیکھا تو ان کے پاس تشریف فرما ہوئے اور فرمایا "تمام تعریفیں اس اللہ ذوالجلال کے لئے ہیں

جس نے میری امت میں وہ لوگ پیدا
فرمائے کہ میں اپنے آپ کو ان لوگوں
کے ساتھ روکے رکھوں۔

اس آیت میں اصحاب صفہ کے باب میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبی وہ فاقہ مست اور خستہ حال لوگ جو صبح و شام اپنے اللہ کو پکارتے ہیں اور اس کے مکھڑے کے طلبگار رہتے ہیں جب وہ تیری معیت میں آئیں اور تیری صحبت میں بیٹھے ہوں تو ان سے صرف نظر نہ کر بلکہ دلجوئی اور شفقت کی بہار ان پر نچھاور کر دے۔ سوال ابھرتا ہے کہ ان بظاہر پریشان حال فاقہ مستوں کو اتنی محبت و شفقت کا مستحق ٹھہرایا جا رہا ہے کہ اللہ رب العزت اپنے محبوب ﷺ کو ان کی خاطرداری اور دلجوئی کی تلقین فرما رہا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب کی خاطر ساری دنیا سے منہ موڑ لیا اور صرف محبوب حقیقی کے ہو کر رہ گئے ان کی حالت یہ تھی کہ صبح و شام اللہ کو پکارتے اور اس کی یاد میں محو و مستغرق رہ کر اسی کی رضا اور دیدار کے طلبگار رہتے جیسا کہ پیشتر بیان کیا گیا یہ وہی لوگ تھے جو پہلے بنو صوفہ میں سے تھے اور بعد میں حضور ﷺ کے حلقہ غلامی میں داخل ہو کر اصحاب صفہ کہلائے۔

اہل تصوف سے متعلق حضرت داتا گنج بخشؒ کی روایت کردہ

حدیث

حضرت مخدوم علی ہجویریؒ نے ان ہی اہل تصوف کے بارے میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے جو اگرچہ تعریفاً اصول محدثین کے طریق پر ثابت نہیں ہے لیکن بہ طریق صوفیاء مستند ہے نیز اس کا آیات قرآن اور دیگر احادیث سے متعارض نہ ہونا اور دیگر مصادر اسلام سے اس کی تائید ہو جانا اس کو شرعاً و عقلاً قابل قبول بنا دیتا ہے پھر اس حدیث کا معناً اسلام کے روحانی مزاج سے مطابقت رکھنا بھی اس کی صحت کی دلیل ہے کیونکہ اولیاء و عرفاء کاملین بالعموم جو کچھ بیان کرتے ہیں بالخصوص وہ اقوال جن کی نسبت

حضور ﷺ کی ذات والہ صفات سے ہو وہ معنی کے اعتبار سے قرآن وسنت کے تابع اور درست ہوتا ہے اس لئے کہ ان کا جو روحانی و قلبی تعلق ہوتا ہے اس بنا پر محال ہے کہ وہ کوئی غلط بات ذات اقدس ﷺ سے منسوب کریں گویا وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں حضور ﷺ سے پوچھ کر کرتے ہیں اس ضمن میں ایک واقعہ کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

ایران میں شیخ روزبہان بقلی شیرازیؒ ایک بزرگ صاحب حال ہوئے ہیں جنہوں نے "عرائس البیان" کے نام سے ایک تفسیر بھی لکھی۔ یہ علم حدیث میں اتنا بلند پایہ رکھتے تھے کہ بڑے بڑے علماء و محدثین ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کا درس لیتے تھے ان کا معمول یہ تھا کہ گردن جھکائے ہوئے خاموشی سے حدیث سنتے رہتے ان کی خاموشی اس بات کی دلیل ہوتی کہ حدیث صحیح ہے اور اس طرح محدثین اس حدیث کی تصدیق کر لیتے اور اگر کہیں وہ چونک پڑتے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ حدیث مذکورہ مرفوع نہیں ہے ایک موقع ایسا بھی آیا کہ کسی محدث نے ایک حدیث پڑھی جس کا مرفوع ہونا کتابوں میں درج تھا۔ انہوں نے چونک کر کہا کہ یہ حدیث حضور ﷺ سے ثابت نہیں۔ محدث نے چند کتابوں کا حوالہ دیا اور کہا کہ فلاں فلاں ناقدین فن نے اس حدیث کی تصدیق کی ہے یہ سن کر حضرت شیخ بقلی فرمانے لگے کہ میں تیری کتابوں کو دیکھوں یا صاحب بیان کو دیکھوں؟ وہ دیکھو سامنے حضور ﷺ کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ روض یہ حدیث میری نہیں ہے بلکہ میری طرف غلط منسوب کی گئی ہے۔ (حضرت روض بہان بقلی کی یہ کرامت شیراز میں آپ کے مزار کی لوح پر کندہ ہے اور اہل شیراز میں نسلاً بعد نسل بتواتر منقول و مشہور ہے)

حضور ﷺ سے روحانی و قلبی تعلق سے ان اہل دل کو وہ نور بصیرت حاصل ہوتا ہے کہ پردے اٹھ جاتے ہیں اور حجابات مرتفع ہو جاتے ہیں۔ وہ دوسروں سے نہیں بلکہ براہ راست حضور ﷺ سے نسبت قائم کر لیتے ہیں اور جو بھی بات کہتے ہیں حضور ﷺ کی اجازت سے کہتے ہیں۔

امام جلال الدین سیوطیؒ نے عالم بیداری میں ستر مرتبہ حضور ﷺ کی

زیارت کا شرف حاصل کیا جب بھی کوئی الجھن اور لاینحل مسئلہ پیش آجاتا تو وہ مراقبے میں جا کر پوچھ لیتے اور عالم بیداری میں آپ کا دیدار ہو جاتا اور مسئلہ حل ہو جاتا۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا' حضرت علی ہجویری" کی کشف المحجوب میں نقل کردہ حدیث یوں ہے کہ

من سمع صوت اهل التصوف فلایؤمن علی دعائہ کتب عند اللہ من الغافلین	جس نے اہل تصوف کی ندا سنی اور اس پر کان نہ دھرا اس کا شمار اللہ کے نزدیک غافلوں میں ہو گیا۔

(کشف المحجوب: ۳۱)

اس حدیث سے دو حقیقتیں آشکار ہوتی ہیں اول یہ کہ تصوف کا لفظ خود نبی اکرم ﷺ کے قول مبارکہ سے ثابت ہے۔ دوم یہ کہ اہل تصوف کی راہ ہی تقویٰ اور پرہیزگاری کی راہ ہے اور اس راہ سے منحرف ہونا غفلت اور بدبختی کی دلیل ہے۔

حدیث رسول ﷺ اور قرآن کی تعلیم

حدیث مذکورہ بالا کو اگر قرآن پاک کی درج ذیل آیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو حقیقت حال آئینہ ہو جائے گی اللہ رب العزت حضور ﷺ کو از راہ تعلیم ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (الکہف' ۱۸: ۲۸)	اور آپ بھی اپنی آنکھیں دنیاوی زندگی کی رونق کے خیال سے ان سے نہ ہٹائیں اور آپ اس شخص کا کہنا نہ مانیں جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔

یعنی اے پیارے رسول! آپ ان سے صرف نظر نہ کیجئے اور انہیں اپنی نگاہ کرم سے محروم نہ کیجئے۔ ان سے نگاہیں پھیرنے کا قرآن یہ مطلب لے رہا ہے کہ ایسا کرنا حیات دنیوی کی زیب و زینت میں کھو جانے اور اللہ کے ذکر سے غافل ہو جانے کے

مترادف ہے لیکن ایسا تو ممکن نہیں کہ آپ دنیا کی زینت کے طلبگار ہوں۔ دراصل مراد یہ ہے کہ جب آپ عملاً حیات دنیوی کی زیب و زینت کو ایک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے اور ان طالبان دنیا کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے جو بادۂ غفلت سے مخمور ہو کر یاد الٰہی سے غافل ہیں تو پھر آپ اپنے لطف و کرم اور توجہ کا مرکز میرے ان بندوں کو بنایئے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھال کر لحظہ بھر میری یاد سے غافل نہیں ہوتے ان خدامست سچے طالبان حق اور ہمہ وقت ذکر الٰہی میں محو رہنے والے بندوں سے صرف نظر کرنے والا حضرت علی ہجویری کی بیان کردہ حدیث کے مطابق اللہ کے ہاں اہل غفلت میں شمار ہوتے ہیں اس طرح قرآن پاک نے اس حدیث کی معنوی تائید بھی فرما دی اور یہ نقطہ بھی واضح ہو گیا کہ تصوف کی راہ سے ہٹنے والوں کا شمار غافلوں اور بیگانوں میں ہوتا ہے۔

یہاں یہ حقیقت حرز جان کر لینی چاہئے کہ صوفیاء کے ہاں غفلت انتہائی معز اور نقصان دہ ہے اور حیات روحانی کے لئے زہر ہلاہل کا حکم رکھتی ہے۔ اہل دل اور باخدا لوگ اللہ سے رو رو کر اور پکار پکار کر التجا کرتے ہیں کہ اے باری تعالیٰ ہمیں غفلت سے بچا کر اہل روحانیت اور رہ نوردان حق کے لئے اس سے بڑی آفت اور ان کی راہ میں اسے بڑی رکاوٹ اور کوئی نہیں ہے۔ ایک لمحے کی غفلت صدیوں کی مسافت کے بعد طے کردہ منزل سے محروم کر دیتی ہے۔

یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ منزل دور شد

عارف کامل حضرت سلطان باہوؒ غفلت کی ضرر رسانیوں سے اہل دل کو یوں خبردار کرتے ہیں۔

جو دم غافل سو دم کافر

یعنی اہل دل کے ہاں غفلت کا ایک لمحہ حالت ایمان سے حالت کفر میں پہنچا دیتا ہے صوفیاء کے ہاں غفلت ایمان سے محرومی کا نام ہے اس لئے کہ اگر ایک لمحے کے لئے توجہ محبوب سے ہٹ جائے یا محبوب کی نگاہ التفات بندے سے ہٹ جائے تو صوفیاء کے

نزدیک یہ حالت بندے کے لئے حالت کفر ہے۔

شیخ ابو العباس مرسیؒ ایک ولی کامل گزرے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

لو حجب عنی رسول اللہ ﷺ طرفة عين ما عددت نفسی من جملة المسلمين	اگر پلک جھپکنے کی مدت کے لئے بھی نبی اکرم ﷺ کا رخ اقدس میری نظروں سے اوجھل ہو جائے تو میں خود کو مسلمان تصور نہیں کرتا۔
(روح المعانی، الاحزاب: ۴۰)	

اس قول سے ظاہر ہوا کہ اہل دل محبوب کی یاد میں ہمہ وقت مستغرق رہنے کو ایمان جانتے ہیں اور غفلت کے اندر گزرے ہوئے ایک لمحے کو بھی کفر گردانتے ہیں اس لئے تصوف دل کی تمامتر رغبت اور توجہ کو اللہ کی طرف مرتکز کر دینے کا اور غفلت اللہ سے توجہ ہٹالینے کا نام ہے۔

گذشتہ تمامتر بحث کا خلاصہ اور ماحصل یہ ہے کہ تصوف سربہ سراسلام کے بطن سے پھوٹنے والا سرچشمہ ہے اور اس کا ماخذ قرآن وسنت کے سوا کچھ نہیں۔ شجر اسلام کی آبیاری تصوف کے چشمہ آب حیات سے ہی ممکن ہے اور اگر تصوف کے سوتے خشک ہو گئے تو شجر اسلام کی قوت نمو شل ہو جائے گی اور وہ برگ وبار پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائے گا۔

جیسا کہ بصراحت ذکر کیا گیا کہ تصوف کی اصطلاحات کو دور اوائل اسلام میں موجود تھیں لیکن بوجوہ اکثر لوگ ان سے ناآشنا تھے اور ان کا باقاعدہ استعمال نہ ہوتا تھا یہاں سوال ابھرتا ہے کہ ان اصطلاحات کے عدم استعمال کا سبب کیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ اصحاب رسول ﷺ میں اسلام کے روحانی تقاضوں سے متعلقہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں، وہ صوفی، درویش، متوکل، راضی برضائے مولا، محب اور محبوب سبھی کچھ تھے۔ غرضیکہ وہ ان سب اوصاف سے متصف جو حیطۂ خیال میں آسکتے ہیں لیکن ان سب خوبیوں میں سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑا وصف جو ان کے لئے وجہ افتخار وناز تھا وہ ان کا حضور ﷺ کی صحبت سے فیض یافتہ ہونا تھا اور یہ اتنا بڑا شرف اور

اعزاز تھا کہ اس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ حضور ﷺ کی صحبت میں بیٹھنے والے ہر ایمان دار مرد اور عورت کو صحابی اور صحابیہ کے معزز و قابل رشک لقب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ صحبت مصطفوی کا فیض یافتہ اور خوشہ چین ہر خوش نصیب صحابی تھا۔ جبکہ صوفی (صوف) یعنی اونی لباس پہننے والے کو کہا جاتا تھا اس لئے صحابی سے بڑا اور بہتر لقب ان کے لئے کوئی اور نہ تھا اور اس میں کیا کلام ہے؟ صحابی کا مقام و مرتبہ اتنا بلند ہے کہ لاکھوں، کروڑوں اولیاء غوث اور قطب چاہے کتنے بلند و ارفع مقامات طے کر لیں وہ صحابی کے مقام کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ صحابیت کا جو شرف ان کے حصے میں آیا اس کے مقابلے میں باقی سب شرف و اعزاز ہیچ تھے۔ صحابیت وہ مقام ہے جسے باقی تمام مقامات پر تقدم و عظمت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے اس لقب کے علاوہ کسی بھی اور لقب سے پکارا جانا کبھی پسند نہ فرمایا۔ پھر حضور ﷺ کے حیات ظاہری سے پردہ فرمانے کے بعد صحابہ کی صحبت سے فیض اٹھانے والے تابعی کہلائے۔ یہی حال ان تابعین کا تھا۔ ان کے نزدیک صحبت صحابہ کا شرف اور اس سے منسوب لقب دوسرے سب القاب سے اس لئے عزیز تر تھا کہ یہ لقب ایک واسطے سے حضور ﷺ سے براہ راست نسبت کے اعزاز پر دلالت کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تابعین حضور ﷺ کے صحابہ کے فیض صحبت کی بنا پر حاصل ہونے والی نسبت کو چھوڑ کر کسی اور لقب پر راضی نہ تھے اس بیان کی تائید و توثیق مندرجہ ذیل علماء نے بھی کی ہے۔

۱۔ شیخ ابو نصر سراج طوسی (کتاب اللمع: ۲۲)

۲۔ امام ابو القاسم قشیری (الرسالۃ القشیریہ: ۸)

۳۔ حاجی خلیفہ صاحب کشف الظنون (کشف الظنون، ۱: ۴۱۴)

۴۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی (تصوف اسلام: ۶۶-۶۷)

پھر استبداد زمانہ سے حالات اور رسم و رواج بدلتے چلے گئے، نئے نئے القابات و اصطلاحات معرض وجود میں آئیں لہٰذا اہل دل اور اہل صفا نے بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کے تحت صفائے باطن کے حوالے سے لقب "صوفی" کو اختیار کرنے

میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔

مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ اسی موقف کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فانفرد خواص اهل السنة المراعون انفاسهم مع الله تعالی الحافظون قلوبهم عن طوارق الغفلة باسم التصوف واشتهر هذا الاسم بهؤلآء الاکابر قبل المأتین من الهجرة

(نفحات الانس: ۲۰، مترجم: ۱۷۴)

پھر وہ خواص اہل سنت جن کے نفوس ذات حق سے منسلک تھے اور جو اپنے قلوب کو غفلت کے طاری ہونے سے محفوظ رکھتے تھے۔ اصطلاح تصوف کے ذریعے منفرد و ممتاز ہو گئے یعنی خود کو اہل تصوف کہنے لگے اور یہ نام ان اکابرین کے لئے دوسری صدی ہجری کے خاتمہ سے قبل شہرت پا گیا۔

باب سوم

مطالعہ تصوف کی علمی اور دینی ضرورت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزشتہ دوابواب میں ہم نے الفاظ "تصوف" اور "صوفی" کے مادہ ہائے اشتقاق ان کے مختلف مفاہیم اور بتدریج ترویج کے حوالے سے مفصل بحث کی ہے۔ اس باب میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مطالعہ تصوف، فہم تصوف اور تعلیمات تصوف پر عمل کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ آیا تعلیمات تصوف کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونا دین اسلام پر کاملاً عامل ہونے کے لئے ضروری ہے؟ آیا اس فلسفہ کو اپنائے بغیر ایک کامل مسلمان کی زندگی نہیں گزاری جا سکتی؟

دراصل مطالعہ تصوف، فہم تصوف اور تعلیمات تصوف پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت تین جہتوں سے ہے۔ مطالعہ تصوف کی پہلی ضرورت علمی و دینی نقطہ نظر سے ہے۔

(ا) دینی نقطہ نظر سے مطالعہ تصوف کی پہلی ضرورت علمی و دینی نقطہ نظر سے ہے۔

(ا) دینی نقطہ نظر سے مطالعہ تصوف اس لئے ناگزیر ہے کہ دین متین کا جامع علم اور اسلامی تعلیمات کا ہمہ پہلو فہم اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے۔ جب روح دین کے تناظر میں دین کو پڑھا اور سمجھا جائے روح دین کیا ہے؟ اگر ہم مختصر طور پر بیان کرنا چاہیں تو روح دین یہ ہے کہ بندہ اللہ کے دین کا باطنی مظاہر کا پابند ہو کر اس کے تمام تر تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی شخصیت کو ہر جہت سے اللہ کے رنگ میں پوری طرح رنگ لے اور اس کی اطاعت و محبت کی منزلوں کو عبور کرتے ہوئے کیفیات عشق سے ہم کنار ہو جائے۔ یہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کا نقطہ عروج ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے رہنمائی فرمائی۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً — رنگ اللہ ہی کا ہے اور اللہ کے رنگ

(البقرہ، ۲:۱۳۸)

سے حسین کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟

تصوف کا مقصد انسان کو اس قدر روحانی بلندی عطا کر دینا ہے کہ وہ محبوب حقیقی کی محبت میں فنا ہو جائے اور کیفیت نصیب ہو کہ

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

(ب) مطالعہ تصوف کی ضرورت کا دوسرا پہلو عمل ہے۔ جب دین کی روح آشکار ہو جائے تو لازم ہے کہ عمل میں بھی وہ روح جاری ہو اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے سعی وکوشش کی جائے۔

چونکہ تصوف روح دین ہے۔ اس تصور کو قرآن یوں واضح کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً — اے اہل ایمان! دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ (البقرہ ۲: ۲۰۸)

عملی نقطہ نظر سے تصوف کی ناگزیریت متحقق ہو جاتی ہے۔ اگر روحانی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو انسان کی حقیقی عظمت ورفعت شکم پرستی یعنی مادی ضروریات کے حصول اور فراوانی میں نہیں بلکہ دل یعنی روحانی بلندی اور رفعت میں ہے۔ بقول مولائے روم۔

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

گویا روحانی رفعت کی ارفع منزل دید دوست ہے۔ روحانیت ومادیت یا دل اور شکم کی کشاکش میں اگر دل جیت جاتا ہے تو انسان واصل محبوب حقیقی ہو جاتا ہے اور اگر شکم جیت جائے اور دل مرغ نیم جاں کی طرح قفس شکم میں محبوس ہو جائے تو زندگی

یہ حدیث بھی مد نظر رہے۔

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ

اور احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت ایسے کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔

شرمندگی بن کے رہ جاتی ہے۔ بقول نباض ملت

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

مقصود کلام یہ ہے کہ تصوف انسان کی روحانی بلندی کے لئے ناگزیر ہے اور انسان میں کمال انسانیت متحقق ہونے کے لئے روحانی ترفع ناگزیر ہے گویا تصوف روحانی اعتبار سے لازمۂ اسلام وانسانیت ہے اور روحانی بلندی عفت قلب ونگاہ اور جذبہ وخلوص کا حامل انسان ہی انسانی تمدن کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

تصوف کی عملی ضرورت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اجتماع افراد کا نام ہی معاشرہ ہے جب کافی افراد کسی باہمی تعلق کے باعث ایک منظم صورت اختیار کرلیں تو یہ منظم اجتماع معاشرہ کہلاتا ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت بدیہی ہے کہ جیسی قلبی وذہنی صلاحیتوں اور کیفیتوں کے افراد جمع ہوں گے اسی معیار کا معاشرہ تشکیل پا جائے گا۔ پس ایک مثالی معاشرہ وجود میں لانے کے لئے ایسے افراد تیار کرنا ناگزیر ہے جو گفتار وکردار کے لحاظ سے خود مثالی ہوں۔ اعلی مقاصد کی خاطر عزیمت کے ساتھ جدوجہد کرنے والے ہوں تاکہ معاشرہ انسانی رشک فردوس بریں بن سکے۔ اللہ کی بندگی کا رنگ ان پر اس طرح چڑھ جائے کہ ان کی ہر ہر ادا شان الٰہی کی دلیل بن جائے ان کی شخصیتیں جمال مصطفوی کے پرتو سے جمیل واجمل ہو جائیں۔ ان کو دیکھ کر بلال رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کی یاد آ جائے۔ اور ذات کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (الرحمٰن ۵۵ : ۲۹) (یعنی اللہ سبحانہ ہر روز ایک نئی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے) کا عکس جمیل ان میں ہر لمحہ جھلکتا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

ظاہر ہے کہ عملی وروحانی تربیت کے بغیر سیرت میں وہ بلندی وعظمت پیدا نہیں ہوتی جو ایک مثالی معاشرہ کے افراد کی سیرت میں ہونا ناگزیر ہے اور اگر ایسے افراد تیار نہ ہو سکیں۔ تو مثالی معاشرہ قائم کرنے کی آرزو حسرت میں بدل جاتی ہے۔ جبکہ یہ

حقیقت اپنی جگہ آشکار ہے کہ تصوف ہی روحانی تربیت کا وہ بہترین نظام ہے جو ایک مثالی معاشرہ کے قیام ضمانت فراہم کرتا ہے۔

(ر) مطالعہ تصوف کی ضرورت اعتقادی وسائنسی نقطہ نظر سے گزشتہ ادوار کی نسبت آج کے دور میں اور بھی زیادہ ہوگئی ہے کیونکہ تعلیمات تصوف کو سمجھے اور ان پر عمل پیرا ہوئے بغیر مسلمانوں کے عقائد و نظریات خالی خولی عقائد تو رہ سکتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر رسوخ پیدا کر کے انہیں یقینیات کے درجے پر صرف تعلیمات تصوف ہی پہنچا سکتی ہیں اس لئے عقائد اسلامی کو زندگی میں زندہ و متحرک فلسفہ کے طور پر رائج کرنے کے لئے تعلیمات تصوف کا اپنانا لازمی ولابدی ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی مدنظر رہے کہ جو دین اللہ نے انسانیت کے لئے پسند فرمایا اور اپنے محبوب ﷺ کو اس کا داعی بنا کر بھیجا اس کا نام اسلام ہے۔ جیسا کہ پروردگار عالم نے فرمایا:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ (آل عمران ٣:١٩)

اللہ کی مرضی یہ ہے کہ انسان کو تمام تر توجہات کا مرکز و محور صرف اور صرف اسلام ہو۔ اس لحاظ سے دینی علوم کو ہر پہلو سے جاننا لابدی ہے۔

علی وجہ التحقیق اس کی حقانیت کا یقین کر لینا اور پھر سائنسی و اعتقادی بنیادوں پر اس کا ثابت کرنا بھی لابدی ہے تاکہ اسے علمی و برھانی سطح پر فوقیت سے ہمکنار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس پہلو سے بھی روح دین یعنی تصوف کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

تصوف کی ضرورت و اہمیت کے حوالے سے مفصل و مدلل بحث کے لئے اب ہمارے سامنے تین اہم جہتیں ہیں۔ جن پر کماحقہ' بحث کئے بغیر موضوع زیر بحث کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یعنی

تصوف کی ضرورت و اہمیت

۱: علمی و دینی نقطہ نظر سے

۲: عملی نقطہ نظر سے

۳: اعتقادی و سائنسی نقطہ نظر سے

تصوف کی ضرورت و اہمیت

۱۔ علمی و دینی نقطہ نظر سے!

دین اسلام کے پورے نظام کو اگر مختلف شعبوں میں تقسیم کرنا مقصود ہو تو اس نظام کے اہم اور بڑے تین شعبے سامنے آتے ہیں:

۱: علم العقائد

۲: علم الاحکام

۳: علم الاخلاص

۱۔ علم العقائد

اس سے مراد دین اسلام کا وہ شعبہ ہے جس کا تعلق ایمانیات و عقائد سے ہے یعنی وجود باری تعالیٰ' توحید اور ذات و صفات میں اس کے یکتا و بے مثل ہونے پر ایمان لانا' انبیاء و رسل' ملائکہ 'کتب و صحف آسمانی' تقدیر کہ ہر خیر و شر اللہ کی مشیت سے ہے' قیامت' حشر و نشر جنت و دوخ' میزان و صراط وغیرہ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے پر ایمان لانا وغیرہ ایسے امور ہیں۔ جنہیں ہم ایمانیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ شعبہ دین کی اصل ہے اور یہی شعبہ جب ایک باقاعدہ صورت میں آگے بڑھتا ہے اسلامی عقائد کو مختلف فکری و نظریاتی کجروی کے عوارض سے محفوظ رکھتا ہے اور اس سے ٹکرانے والے ہر نظریے کا بطلان کرتا ہے تو یہ ایک باقاعدہ فن یعنی علم الکلام یا "علم العقائد" کہلاتا ہے۔ عقائد چونکہ اعمال و افعال کی اصل ہیں۔ اس لئے عقائد و نظریات کی درستی اور پختگی پورے دین میں سب سے مقدم ہے اسلامی عقائد و نظریات اختیار کرنا اور پھر دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ علی وجہ البصیرت ان پر قائم رہنا ہی ایمان ہے۔ یہ جتنا راسخ اور علی وجہ التحقیق ہو گا۔ اتنا ہی اللہ کے ہاں قابل

قدر ہو گا۔ کیونکہ

دین میراث نہیں دین ہے تکمیل شعور!

انسانی فکر و عمل اور کردار کے تمام سوتے اسی علم العقائد سے پھوٹتے ہیں۔

۲۔ علم الاحکام

دین کا دوسرا شعبہ علم الاحکام ہے جس کا مقصد عقائد کی استوار بنیادوں پر عمل اور رویہ حیات کی تشکیل و تعمیر ہے۔ یہ علم انسان کی عملی زندگی سے بحث کرتا ہے۔ جس سے اسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کن کاموں کے کرنے کا حکم دیا یا اجازت مرحمت فرمائی ہے اور کن اقوال و افعال سے منع فرمایا ہے۔ جب یہ علم ایک فن اور سائنس کی صورت میں فروغ پاتا ہے اور اوامر و نواہی کے درجات قائم کر کے انہیں فرائض و واجبات' سنن اور حرام مکروہ وغیرہ کی اصطلاحات کے تحت بیان کیا جاتا ہے تو اس علم الاحکام کو اہل علم اصطلاح میں علم الفقہ کا نام دیتے ہیں۔ اور شریعت مطہرہ کا قانونی شعبہ ہے۔

۳۔ علم الاخلاص

جب عقائد و نظریات اور احکام سے متعلق حقائق آشکار ہو جائیں۔ تو تیسرے شعبے یعنی علم الاخلاص کو سمجھنے کے لئے راہ ہموار ہوتی ہے۔ جادۂ اخلاص کا نقطہ آغاز سمجھنے کے لئے یہ حدیث نبوی ﷺ ہر دم پیش نظر رہنی چاہئے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

انما الاعمال بالنیات — بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

(صحیح بخاری' ۱:۲)

گویا جس طرح اعمال کے لئے صحت عقائد لازمی ہے اسی طرح اعمال و افعال کی قبولیت کے لئے صحت نیت بھی لابدی ہے۔ اعمال اللہ کی بارگاہ صمدیت میں اسی وقت شرف قبولیت سے مشرف ہوتے ہیں۔ جب نیت درست ہو۔

آغاز فعل میں یا دوران فعل قلب وذہن کے کسی گوشہ میں بھی بناوٹ اور ریاکاری کاشائبہ تک نہ ہو بلکہ عمل کا آغاز وانجام سراسر خلوص پر مبنی ہو اور مقصود نظر صرف اور صرف رضائے الٰہی ہو اگر کیفیت یہ نہ ہو اور ذہن اغراض دنیوی وریاکاری کے بتوں کا صنم خانہ ہو تو اس حالت میں کیا جانے والا عمل بظاہر خواہ کتنا ہی محمود ہو اسے بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت حاصل نہیں ہوتا۔

ظاہروباہر ہے کہ زبان سے خواہ کیسی ہی نیت کا اظہار کیا جائے بارگاہ صمدیت سے صلہ وداد پانے کے لئے اس کا تعلق قلبی جذبات وکیفیات کے حوالے سے جانچا جاتا ہے۔ جنہیں نہ تو کوئی بصارت سے دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی عدالت ان پر فیصلہ صادر کرسکتی ہے کیونکہ ان رازوں کو معبود اور عبد کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ (آل عمران ۳:۱۱۹)	بے شک اللہ رب العزت دلوں کے رازوں سے خوب آگاہ ہے۔

یہی سبب ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ لاینظر الیٰ صورکم و اموالکم و لکن ینظر الیٰ قلوبکم و اعمالکم (صحیح مسلم ۱:۳۱۷)	بے شک اللہ تمہاری شکلیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں (کی کیفیت) اور اعمال کو دیکھتا ہے۔

ثابت یہ ہوا کہ قبولیت اعمال کے باب میں خدائے علیم وخبیر اپنے بندے کے دل کو دیکھتا ہے۔ کہ اس نے یہ نیکی کس نیت سے کی۔ اگر نیکی اور سخاوت کے پیچھے کارفرما جذبہ نیک اور سخی کہلانے کا نہیں۔ بلکہ نیکی وسخاوت مع اپنے جذبہ محرکہ کے محض رضائے الٰہی کے لئے ہے تو ایسی ہی نیکی اللہ کی بارگاہ بے نیاز میں مقبول ومحمود ہے اسی حسن نیت کو اخلاص کہا جاتا ہے۔ اخلاص نظام دین میں نیتوں کی اصلاح اور صحت کا اہم شعبہ ہے جو اہل علم کی اصطلاح میں علم الاخلاص سے موسوم ہوتا ہے۔

جب اخلاص اعمال کی روح بن جائے تو اعمال کو ریاکاری سے پاک کردیتا ہے۔ ریاکاری کا منافقت سے گہرا تعلق ہے اور یہ اپنی جگہ شرک خفی کی ایک قسم ہے

جس کی نیت خالصتہً لوجہ اللہ عمل کرنے کی ہو جائے وہ جہاد اس لئے نہیں کرے گا۔ کہ اسے غازی کہا جائے' وہ اللہ کی راہ میں مال و دولت اس لئے نہیں لٹائے گا کہ لوگوں میں سخی کہلائے' اس کی شب بیداری آہ سحر گاہی اس لئے نہ ہو گی کہ عابد و زاہد مشہور ہو جائے' اس کے کسی عمل کا محرک شہرت و ناموری اور دنیوی جاہ و حشمت یا عظمت و سربلندی نہ ہو گی۔ نیکی کرنے میں اس کا مقصود نظر صرف اللہ کو راضی کرنا ہو گا۔ اور اس کی تمام زندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے صرف ہو گا۔

نیت کو اخلاص کے نور سے منور کر دیا جائے تو اعمال میں اخلاص کی برقی رو دوڑ جاتی ہے جو اعمال کو ثمربار کر دیتی ہے۔ پھر مسلسل مجاہدہ و ریاضت سے یہ اعمال اخلاص کے اعتبار سے اپنے نقطہ کمال پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور انہیں بارگاہ صمدیت میں شرف قبولیت حاصل ہو جاتا ہے۔ اعمال کو اخلاص کے حسن سے مزین کرنے والا اور عشق و محبت کے نور سے مستنیر کرنے والا یہی شعبہ جب ایک فن کی صورت میں فروغ پاکر ایک عالم کو اپنے دامن الفت میں پناہ دیتا ہے۔ تو علم التصوف یا علم الطریقت کہلانے لگتا ہے۔ جسے دوسرے لفظوں میں صفائے باطن کا علم بھی کہا جاتا ہے۔

اب یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ پورا دین تین بڑے شعبوں پر مشتمل ہے۔ اور کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر شرعاً اور عقلاً دین کی حقیقی روح سے غیر متعلق یا بعد کی چیز ہونے کا شبہ بھی کیا جا سکے اور نہ ہی کوئی ذی شعور یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ عجمی اثرات کا نتیجہ یا ویدانیت سے ماخوذ ہے۔ سطح بینی اور خشیت قلب و باطن کی کیفیات سے محرومی کے باعث دین کے ایک تہائی حصے کو گردن زدنی اور دریا بردنی قرار دینا آخر کہاں کی خدمت دین ہے۔

ان تینوں شعبوں کا باہمی ربط و تعلق اتنا فطری اور مضبوط ہے کہ اس میں رخنے ڈالنے سے دین کا تصور ناقص ہو جاتا ہے۔ اور دین کے پورے نظام میں ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا۔

بقول غالب

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

جب انسان اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان کے شعور سے بہرہ ور ہونے کے بعد جب اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ پروردگار نے مجھے روزانہ پانچ وقت نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور میرے آقا و مولا ﷺ نے اس نماز کے ادا کرنے کا یہ علمی و عملی طریقہ سکھایا ہے تو اسے علم العقائد اور علم الاحکام تک رسائی ہو جاتی ہے۔ جب وہ نماز ادا کرنے کے لئے صاف ستھرے کپڑے زیب تن کر کے پاک صاف پانی کے ساتھ ازابتدا تاانتہا اہتمام کے ساتھ وضو کرتا ہے اور پھر قبلہ رو ہو کر نماز کی باقاعدہ ادائیگی کا آغاز کرتا ہے جملہ فرائض وواجبات اور سنن و مستحبات تک کا لحاظ رکھتے ہوئے نماز ادا کرلیتا ہے تو اس نے علم العقائد اور علم الاحکام تک اپنی ذہنی رسائی کے تقاضوں کو عملاً پورا کر دیا کیونکہ اس کی نماز فقہ کے تمام اصولوں پر پوری اترتی ہے۔

ظاہری صورت کے اعتبار سے تو نماز مکمل ہے لیکن یہ امر محل نظر ہے کہ آیا اسے نماز نے وہ کچھ دے دیا جو کچھ نماز دے سکتی ہے؟

عین ممکن ہے کہ نمازی کا چہرہ تو قبلہ کی جانب ہی رہا ہو لیکن اس کا دل ایک محشر خیال ہو جس میں بیوی بچوں' گھر' دفتر' دکان یا کسی اور جگہ کے خیالات کا جمگھٹا رہا ہو۔ جو کچھ زبان سے ادا ہو رہا تھا وہ دل کا نہیں بلکہ حلق اور زبان (صرف گوشت کے لوتھڑے) کا وہ رٹا رٹایا عمل تھا۔ جو کثرت مشق سے نیند میں بھی ہو جایا کرتا ہے۔ جبکہ دل اپنے دنیوی امور و معاملات اور سیر و تفریح میں مصروف تھا اگر مذکورہ حدیث نبوی پر دوبارہ غور کیا جائے تو آدمی لرز کے رہ جاتا ہے کہ جب اللہ سبحانہ دلوں کا حال جانتے ہیں اور نمازی کی کیفیت یہ ہے کہ

دل سوز سے خالی نگہ پاک نہیں ہے

تو ایسی نماز کی اللہ کی بارگاہ میں کیا حیثیت ہوگی؟ جس کا دل عین حاضری کے لمحوں میں بھی اللہ سے نہ جڑ سکا بلکہ دنیا میں مشغول رہا۔ جبکہ بظاہر تمام تقاضے پورے کر دیئے گئے۔ اس کی نماز علم الفقہ کے مطابق تو ادا ہو گئی لیکن علم الاخلاص کی نظر میں وہ

سرے سے نماز ہی نہیں کیونکہ علم الاخلاص کا تعلق تصفیہ باطن اور دل سے ہے۔ جب قلب نماز کی کیفیت و سرور سے محروم ہو کر تارک نماز رہا ہو تو شرف قبولیت کس عمل کو ملے گا۔ قبولیت کا سہرا اسی عمل کے سر باندھا جاتا ہے جو خلوص نیت اور دل کی حضوری سے کیا جائے وہ لاشہ بے جان ہے یا پھلوں کی وہ دکان ہے جہاں چھلکے سجا کر لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہو۔ مدعا یہ کہ نماز کو حرکات و سکنات کی ایک مشق کی بجائے حقیقی نماز بنانے کے لئے جس طرح چہرہ کعبہ کی طرف متوجہ رہا اسی طرح دل کا رب کعبہ کی طرف متوجہ رہنا بھی لازمی ہے جس طرح جسم اور لباس کو ظاہری نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک وصاف رکھا گیا۔ اسی طرح دل کو باطنی نجاستوں سے پاک کرنا بھی ضروری ہے جب دل باطنی نجاستوں سے پاک ہو جائے گا تو یقیناً وہ زبان کی موافقت کرے گا اور دل و زبان کی رفاقت و ہم آہنگی متحقق ہو گی اگر دل کو صفا و جلا حاصل نہ ہو سکے تو شاید عمر بھر ایسی ایک نماز پڑھنا بھی میسر آ سکے جس میں دل کی تمام توجہات محبوب حقیقی پر مرکوز ہو سکیں اور حقیقی نماز کا لطف و سرور حاصل ہو سکے۔ یہاں صرف نماز کے اندر دین کے تینوں شعبے باہم اس قدر استوار و مربوط اور غیر منفک نظر آتے ہیں اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ہر فعل کے اندر یہ تینوں شعبے اسی طرح باہم مربوط و منسلک نظر آتے ہیں اور ہر مرحلے پر ان کا باہمی ربط و ضبط اس قدر استوار ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا کوئی تصور نہیں۔ اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنے کے لئے معلوم ہونا چاہئے کہ

۱۔ شعبہ عقائد کے دفاع اور ترویج و اشاعت کا کام علمائے متکلمین سرانجام دیتے رہتے ہیں۔

۲۔ شعبہ احکام کو محفوظ و مدون کرنے اور ان احکام کی تبلیغ و اشاعت کی سعادت فقہا و محدثین کے حصے میں آئی ہے جبکہ

۳۔ دلوں کی صفائی اور باطنی اصلاح کا کام صوفیاء عرفاء اور اولیاء اللہ کے بابرکت حلقوں سے انجام پاتا ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنے دین کے تین اہم شعبے بنائے تو اپنے اہل علم بندوں

کے بھی تین طبقات بنا دیے اور ان میں سے ہر طبقے کو دین کے ایک شعبے کی حفاظت پر مامور فرما دیا۔ اسلامی عقائد پر حملہ ہو تو متکلمین عقائد کے دفاع میں علمی اور مسکت جوابات کی ڈھال بن جاتے ہیں۔ احکام و اعمال کی تبلیغ و ترویج اور حفاظت و تدوین علماء و فقہاء کرتے ہیں، جبکہ امت محمدیہ ﷺ کے باطنی احوال کو سنوارنا اور نیتوں میں اخلاص پیدا کرنا صوفیائے کرام کا کام ہے یہ تینوں طبقات اپنے اپنے شعبوں کے ذمہ دار ہوتے ہوئے باہم ایک دوسرے سے اسی طرح مربوط و منسلک ہیں جیسے دین متین کے مذکورہ صدر تینوں شعبے ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہیں اور یہ تینوں طبقے باہم متخالف و متصادم نہیں ہو سکتے بشرطیکہ دیکھنے والے کی فکر تضاد، تخالف اور تصادم سے محفوظ ہو۔

مذکورہ صدر بیان کی تائید میں بخاری شریف کی مشہور حدیث کو جو اہل علم میں حدیث جبرئیل کے نام سے مشہور ہے۔ مد نظر رکھنا اشد ضروری ہے۔ ایک دن حضرت جبرائیل علیہ السلام بارگاہ مصطفوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور نبی اکرم ﷺ کے دوزانو سے اپنے دوزانو ملا کر اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی التحیات میں بیٹھتا ہے گویا دوسروں کو ادب تلمذ سکھا رہے تھے لیکن ان کے جسم اور کپڑوں پر سفر کی کوئی علامت نہ تھی۔ وہ بارگاہ رسالت ﷺ میں عرض گزار ہوئے۔ کہ مجھے اسلام کے متعلق ارشاد فرمائیے۔

آپ ﷺ نے اسلام کے بنیادی اعمال و افعال کا ذکر فرمایا اور دین کے اسی شعبے جس کو علم الاحکام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سائل نے دوسرا سوال کیا۔

قال اخبرنی عن الایمان قال، ان تومن باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ والیوم الاخر و تومن بالقدر خیرہ و شرہ قال صدقت

(صحیح بخاری، ۱:۱۲)

کہا۔ پس آپ مجھے ایمان کے متعلق بتائیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتب پر اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور یہ کہ تو ایمان

لائے اچھی بری تقدیر پر' اس نے کہا
آپ ﷺ نے سچ فرمایا۔

یہاں آپ ﷺ نے ایمانیات کا ذکر فرمایا اور یہی اسلام کا وہ دوسرا شعبہ ہے جسے علم العقائد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ عقائد اور احکام پر اسلام کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی ان دونوں کے ہوتے ہوئے بھی دین کا تصور تکمیل آشنا نہیں ہوتا بلکہ ابھی معاملہ ادھورا ہے جس کے باعث سائل کو مزید سوال کرنا پڑتا ہے' چنانچہ حضرت جرائیل علیہ السلام بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں تیسرا سوال کرتے ہیں:۔

رسول اللہ ﷺ نے اس تیسرے سوال کا جواب ان لفظوں میں مرحمت فرمایا:۔

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک	تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو۔ اور اگر نہ دیکھ سکو تو (یہ کیفیت تو رہنی چاہئے کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔
(صحیح بخاری' ۱:۱۲)	

یعنی احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اس تصور کے ساتھ کہ اس کے حسن مطلق کے جلووں کا نظارہ کر رہے ہو اور تمہیں اس بے مثل و بے عدیل ذات کا وصال نصیب ہو رہا ہے اگر اس اعلیٰ کیفیت تک رسائی نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تصور تو ضرور ہو کہ خدائے علیم و خبیر تمہیں دیکھ رہا ہے اور جس طرح تم عبادت کر رہے ہو اس کی نظریں تم پر ہیں۔ اس تصور اور کیفیت کے ساتھ عبادت کرنے کو حضور ﷺ نے احسان قرار دیا اس حدیث میں روح دوعالم ﷺ نے مجموعہ عقائد کو ایمان کے جامع لفظ سے تعبیر فرمایا۔ اس باب میں دین کے جن تین بڑے شعبوں کی تفصیل بیان ہوئی اصلاوہ اس مبارک حدیث کی وضاحت ہے۔

جس طرح فن کی صورت اختیار کر لینے پر علم العقائد کو علم الاحکام کا نام دیا گیا

ہے۔ علم الاحکام' فنی صورت اختیار کر لینے پر علم الفقہ' کہلایا اسی طرح مستقل فن کی صورت اختیار کر لینے پر احسان' یا علم الاخلاص' کو علم التصوف یا علم الطریقت کا نام دیا گیا جو دین کا تیسرا اہم شعبہ ہے۔

شاہ ولی اللہؒ اپنی شہرہ آفاق تصنیف حجتہ اللہ البالغہ میں تزکیہ نفس پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"دوسری حیثیت ان اعمال کی یہ ہے کہ ان کے فعل یا ترک سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور ملکات باطنیہ (فضائل باطن) کی نشوونما ہوتی ہے اس بارے میں اہم بات یہ ہے کہ ان ملکات کا آدمی کو پورا علم حاصل ہو اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ اعمال کیونکر ان کے حصول اور استحکام کا موجب ہوتے ہیں۔ اس کی بنا زیادہ تر وجدان پر ہے اور ان کے متعلق حکمت تشریعیہ کا اقتضاء یہ ہے کہ اس قسم کے معارف کو خود شخص مکلف پر حوالہ کیا جائے۔ بہرکیف پہلی حیثیت سے اعمال کے متعلق بات کرنے کا نام علم شرائع ہے اور دوسری حیثیت سے ان کی بابت بحث و تمحیص کی جائے تو اس کو علم الاحسان کہتے ہیں" (اسی کا دوسرا نام تصوف اور علم طریقت ہے) تفصیل کے لئے امام غزالیؒ کی احیاء العلوم پڑھو! (حجتہ اللہ البالغہ مترجم '۲: ۳۵۰-۳۵۱)

دوسرے مقام پر اس کی تائید مزید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"تصوف و طریقت بھی اسلام کا ضروری حصہ ہے جسے حضور ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سوال پر جوابا (احسان) کے نام سے تعبیر فرمایا تھا۔ جبکہ خود جبرائیل علیہ السلام نے بھی اسے احسان ہی کہا"۔

ثابت ہوا کہ تصوف اور طریقت در حقیقت اسلام سے الگ کوئی اجنبی چیز نہیں ہے تصوف دین پر اضافہ نہیں بلکہ دین کا ایک مستقل شعبہ ہے اور اس کا انکار دین کے ایک اہم شعبے کے وجود کا انکار ہے۔ جو اسلام کے ناقص اور سطحی تصور ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہی تو وہ شعبہ ہے جو اخلاص اور حسن نیت کے باعث عمل کو حسن عطا کر کے عمل احسن کے درجۂ کمال تک پہنچاتا ہے اور اللہ کی بارگاہ صمدیت میں

قبولیت کے لائق بناتا ہے۔

یہاں ایک نکتے کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ تم اللہ کی عبادت اس حال میں کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو اور اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:۔

فان لم تکن تراہ فانہ یراک اگر تم اسے نہ دیکھ پاؤ تو کم از کم یہ کیفیت ضرور حاصل ہو کہ اس کی نگاہیں تم پر جمی ہوئی ہیں۔

علمائے کرام نے اس کے دو معنی بیان کئے ہیں ایک تو وہی جو اوپر گزر چکا ہے یعنی کیفیت تو یہ ہونی چاہئے کہ تم ذات باری تعالیٰ کا دیدار کر رہے ہو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تصور تو ضرور ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے ظاہر جب بندے کے ذہن میں یہ تصور جاگزیں ہو گا کہ میرا پروردگار مجھے دیکھ رہا ہے جو رحمٰن و رحیم ہونے کے ساتھ ساتھ جبار و قہار بھی ہے تو وہ ہرگز کسی غیر کی جانب متوجہ نہ ہو گا۔

مذکورہ تصور تصوف کے لحاظ سے ادنیٰ کیفیت ہے اور اس سے بھی مقصود کسی حد تک حاصل ہو جائے گا۔ کہ یہ تصور کرنے والا بھی غیر کی جانب متوجہ نہ ہو گا۔

نبی اکرم ﷺ نے مذکورہ تصور کے دو پہلو بیان فرمائے ادنیٰ تو یہی جو مذکور ہوا اور اعلیٰ کیفیت یہ کہ مشاہدۂ حق کا تصور ہو جس کو صوفیہ کی اصطلاح میں مشاہدۂ قلب کہا جاتا ہے۔

مشاہدۂ حق کے پیش نظر عرفاء نے **فان لم تکن تراہ** کا دوسرا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اس جملے کے دو حصے ہیں۔ **فان لم تکن** الگ ہے اور **تراہ** الگ ہے۔ **فان لم تکن** شرط ہے اور **تراہ** اس کی جزا ہے۔ گویا فرمان رسالت ﷺ کا مفہوم یہ ہوا کہ **فان لم تکن** یعنی اگر تم نہ رہو' تم فنا ہو جاؤ' تمہاری ہستی درمیان میں حائل نہ رہے تو اس کی جزاء یہ ہو گی کہ **تراہ** تم اسے دیکھ لو گے اور تمہیں مشاہدۂ حق حاصل ہو جائے گا۔ گویا بندے اور خدا کے درمیان جو چیز حائل رہتی ہے۔ وہ خود بندے کی اپنی ذات

ہے جب وہ حجاب ذات کو مرتفع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے مشاہدۂ حق کی دولت میسر آجاتی ہے اور اس منزل مقصود پر لے جانے والا راستہ تصوف ہے اسی تصور کو غالب نے اپنے انداز بیاں اور اپنے رنگ میں یوں بیان کیا ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

اقبال نے بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

شہود کیسے ہو حاصل اسے زمانے میں
وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

ذات مطلق کا دیدار میسر آنا ہی کمال زندگی ہے لیکن جب نظر جسد خاکی کے پنجرے میں بند رہے اور حجابِ ذات درمیان میں حائل رہے۔ بندہ اس وقت تک حسن مطلق کے نظارے سے محروم رہتا ہے۔ اسی لئے ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

کمال زندگی دیدار ذات است
طریقش رستن از بند جهات است

اپنے وجود کی نفی کرنے، اپنی ذات کو ختم کر کے درمیانی پردہ ہٹا دینے اور انانیت کو مٹا دینے سے ذات مطلق ہر سمت جلوہ گر نظر آئے گی۔ بندہ جدھر نظر کرے گا۔ اسے حسن مطلق کے سوا اور کچھ بھی نظر نہ آئے گا۔ اس محبوب کا اپنا قول ہے کہ

فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ (البقرہ، ۲:۱۱۵)

تم جس طرف نظر کرو گے۔ اللہ کے مکھڑے (جیسی اس کی شان ہے) کے جلووں کو پاؤ گے۔

فنائے عارضی اور پھر بقائے دوام کا راز اسی میں مضمر ہے۔ ذات مطلق کا دیدار اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب اپنی ذات کے حجاب کو درمیان سے ہٹا دیا جائے اور اپنی انانیت کو ختم کر کے فنائے کلی کے مقام کو پا لیا جائے۔

یہ وہ مقام ہے جب بندہ خدا کے لئے فنا ہو چکا ہوتا ہے اور پھر وہ ذات باقی

سے تعلق کے باعث باقی رہتا ہے۔ اسی مقام کو حاصل کرنے کی تلقین صوفیائے کرام نے **موتوا قبل ان تموتوا** کے الفاظ میں بیان کی ہے۔

بقا صرف ذات باری تعالیٰ کو ہے اور بندہ جب تک اپنی ذات کے پنجرے میں مقید رہے گا۔ اس وقت تک نہ اسے بقاء کی منزل ہاتھ آئے گی اور نہ ہی وہ حسن مطلق کا مشاہدہ کر سکے گا۔ لہٰذا مشاہدۂ حق کی خاطر اسے اپنی ذات اپنی انانیت' اپنا جسم' اپنی روح اور اپنا وجود یہ سب کچھ فنا کرنا ہو گا کیونکہ یہ تمام چیزیں عالم خلق سے ہونے کے باعث فانی ہیں جب تک ان کا وجود باقی ہے خدا بندے سے محجوب ہی رہے گا اور ان کے فنا ہوتے ہی بندے کو ذات مطلق سے تعلق کے باعث مقام بقا حاصل ہو جاتا ہے بقول غالب

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

خواجہ معین الدین اجمیریؒ (المتوفی ۶۳۳ھ) اس نکتے کو یوں بیان فرماتے ہیں:۔

ولا بحلقہ رندان بزم عشق در آ
کہ جرعہ شراب بقا دھندُ ترا
اگر بقا طلبی اولت فنا باید
کہ تا فنا نشوی رہ نمی بری بقا

اسی نکتے کو ذہن میں رکھ کر دوبارہ ارشاد رسالت مآب ﷺ **وان لم تکن** پر نظر ڈالی جائے یعنی اگر تو نہ رہے تو تراہ تو اسے دیکھ لے گا کیونکہ درمیان میں دوئی کا جو پردہ حائل تھا اگر اسے اٹھا دیا تو حسن مطلق کا مشاہدہ حاصل ہو جائے گا اقبالؒ نے اسی نکتے کو ایک اور مقام پر یوں واضح کیا ہے۔

کرا جوئی کرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز او نیابی

بندہ جب تک اپنی ذات کے خول میں مقید رہتا ہے اس وقت تک ذات مطلق کو تلاش کرنے پر بھی خود ہی کو پائے گا لیکن جب اپنی ہستی کو فنا کردے اور من و تو کا فرق ختم کر دے تو اس وقت وہ اپنی ذات کو تلاش کرے گا تو حسن مطلق ہی کو پائے گا۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
مہر وماہ ومشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

حضرت بایزید بسطامی ؒ (المتوفی ۲۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ کسی وقت میری حالت یہ تھی کہ جب اس کی تلاش میں نکلتا تو سوائے اپنی ہستی کے کچھ نہ پاتا۔ لیکن اب عرصہ بیس سال سے کیفیت یہ ہے کہ خود کو تلاش کرتا ہوں اور ہربار اسی کو پاتا ہوں۔

مذکورہ حدیث نبوی ﷺ اس واقعہ کی تائید وتوثیق کرتی ہے کہ **فان لم تکن تراہ** یعنی اگر تو نہ رہے تو اسے دیکھ لے گا۔

دین متین کا تیسرا شعبہ یہی ہے کہ جسے نبی اکرم ﷺ نے احسان کے نام سے یاد فرمایا اور جس نقطہ کمال تک رسائی کے تمام تر مجاہدے کو صوفیائے عظام تصوف اور طریقت کا نام دیتے ہیں اور جس طرح عقائد دین کے نکتہ آغاز میں احکام راہ وفا کو ہموار کرتے ہیں اور عقائد کے راسخ ہو جانے کی تائید وتوثیق مومن کے عمل سے طلب کرتے ہیں اس طرح یہ احسان اور تصوف وطریقت وہ مستقل اور اہم شعبہ ہے۔ جو اعمال کو منزل مقصود سے آشنا کرتا ہے اور عقائد واحکام کے مقاصد تکمیل آشنا ہوتے ہیں چنانچہ یہ ثابت ہوا کہ ایک سلیم الطبع اور دین کا گہرا فہم رکھنے والے شخص کے لئے تصوف وطریقت کو دین کے دوسرے دوشعبوں سے جدا کرنا ممکن نہیں۔

یہاں امام مالک ؒ کا یہ ارشاد دوبارہ ملاحظہ ہو۔

من تفقہ و لم یتصوف فقد تفسق و من تصوف و لم یتفقہ فقد تزندق و من جمع بینھما فقد تحقق

(مرقاۃ الفاتیح ۱:۲۵۶)

جو فقہ میں ماہر ہوا اور تصوف کو نہ جانا وہ فسق وفجور میں پڑ گیا اور جو تصوف میں ڈوب گیا اور فقہ سے نابلد رہا وہ زندیق ہو گیا۔ اور جس نے دونوں کو جمع کیا اس

نے حق کو پالیا۔

آپؒ کے اس قول سے مترشح ہوتا ہے کہ شریعت کے احکام کی ظاہری ادائیگی کے ساتھ ساتھ ان اعمال کی روشنی سے باطن کو منور کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ظاہر جسم ہے اور باطن روح، اعمال جسم ہیں اور اخلاص روح، روح نہ ہو تو جسم بے کار محض ہے اور جسم نہ ہو تو روح کس وجود میں ڈالی جائے؟ جس طرح ہر شے ظاہر و باطن سے مرکب ہے خود انسان بھی ظاہر و باطن کا مرکب ہے اسی طرح ہر انسانی عمل بھی اپنا ایک ظاہر اور ایک باطن رکھتا ہے۔ مسلمان کے تمام اعمال کے ظاہری اصول و آداب علم الفقہ سے ملیں گے اور باطنی تقاضوں کو علم الاخلاص یا علم التصوف پورا کرے گا ظاہری اصولوں کے تحت کئے ہوئے کام کو باطنی آداب ہی قابل قبول بناتے ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے یہ نقطہ ہمیشہ کے لئے واضح کر دیا اور یہ قاعدہ کلیہ کی حیثیت اختیار کر گیا کہ

انما الاعمال بالنیات — بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

(صحیح بخاری، ۱:۲۰)

اسی لئے آقا دو جہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا:

العلم علمان فعلم فی القلب فذاک العلم النافع و علم اللسان فذاک حجۃ اللہ عز و جل علی ابن ادم — علم دو قسم کا ہے ایک قلبی علم اور یہی علم نافع ہے اور دوسرا زبانی علم اور یہ ابن آدم پر اللہ عز و جل کی حجت ہے!

(مشکوۃ المصابیح: ۷۵)

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ علم دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک علم وہ ہے جو دل کی تختی پر لکھا جاتا ہے اور ایک علم وہ ہے جو زبان سے ادا کیا جاتا ہے زبان سے ادا ہونے والا علم ظاہری علم ہے اور دل کی تختیوں پر لکھا جانے والا علم باطنی علم ہے دل کی تختیوں پر لکھا جانے والا کتابی نہیں کہ ایک کتاب سے دوسری میں منتقل ہو جائے بلکہ یہ علم ایک دل کے چراغ سے دوسرے دلوں کے چراغ کو روشن کرتا چلا جاتا ہے۔

فرمانِ رسالتمآب ﷺ کے تحت دل کی تختی پر لکھے جانے والے علم سے ہی انسان کو نفع حاصل ہوتا ہے گویا نفع بخش علم وہی ہے جو ایسے دل کے سوتوں سے پھوٹے جو تصفیۂ باطن کے باعث معرفت کا بحرِ بے کنار ہو۔ ظاہری علم اگر تنہا ہے تو وہ آدمی پر خدا کی حجت ہے کیونکہ جب تک اسے باطنی علم کے تابع نہ کیا جائے اس وقت تک وہ نفع بخش ثابت نہیں ہوتا اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو امام مالک" کا مذکورہ قول بھی اسی حدیث کی شرح نظر آتا ہے علم ظاہری و باطنی ہی کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

حفظت من رسول اللہ ﷺ وعائین فاما احدھما فبثتہ واما الاخر فلو بثتتہ قطع ھذا البلعوم (صحیح بخاری، ۱:۲۳)	میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو تھیلے یاد کئے ان میں سے ایک کو میں نے عام کر دیا اور اگر دوسرے کو عام کروں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے گا۔

پہلا علم ظاہری ہے اور دوسرا باطنی، پہلا عوام کے لئے اور دوسرا خواص کے لئے جو اپنی زندگی کے احوال اور اپنی روحانی حالت کو درجۂ کمال تک لے جا کر مشاہدۂ قلب حاصل کرنا چاہتے ہیں جبکہ عوام الناس اور ظاہربین حضرات پہلے علم سے ہی لبریز ہو جاتے ہیں جبکہ اہلِ صفا دوسرے علم کے بغیر زندگی کو بیکار سمجھتے ہیں۔ مولائے روم نے اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

برسماع راست ہر کس چیز نیست
طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

انزل القرآن علی سبعۃ احرف منھا ظھر و بطن و لکل حد مطلع (مشکوٰۃ المصابیح: ۳۰)	قرآن مجید کو سات قرآتوں میں نازل فرمایا گیا۔ ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حد کی خبر دی گئی ہے۔

• یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سات قرآتوں میں نازل فرمایا اور ہر قرات یا حرف

کا ظاہر بھی رکھا اور باطن بھی یعنی اس کے اندر ظاہری علوم بھی ہیں اور باطنی علوم بھی۔

امام ابو نعیم اصفہانیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

وان علی ابن طالب عندہ من الظاھر والباطن اور بے شک حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس ظاہری علم بھی تھا اور باطنی بھی۔ (الاتقان للسیوطی '۲: ۱۸۷)

اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ علم ظاہری اور باطنی دو پہلوؤں سے مرکب ہے۔ ظاہری علم درس و تدریس اور جلسوں کی صورت میں دوسروں تک منتقل کیا جاتا ہے جبکہ باطنی علم خاص محفلوں کے ذریعے خواص تک پہنچایا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کو خاص محفل ذکر منعقد فرماتے جو باطنی احوال کے لئے مفید ہوتی تھی۔ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم: ۳۴)

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحاب صفہ کو جہاں ظاہری زیور تعلیم سے آراستہ فرماتے وہاں باطنی تعلیم بھی دی جاتی تھی جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی جا چکی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کرامؓ کو ہدایت فرماتے کہ ظاہری علم کی ہر ایک کو تبلیغ کرو لیکن باطنی علوم کی تبلیغ صرف ان میں کرو جو اس کے اہل ہیں۔

(صحیح بخاری '۱: ۱۴۵)

احتیاط اور تدین کا تقاضا یہ ہے کہ باطنی علم نااھلوں کے سامنے پیش نہ کیا جائے کیونکہ یہ ان کی ذہنی سطح سے بالاتر ہوتا ہے اور ان کی طرف سے تمسخر و استہزاء عیب چینی اور انکار کا سخت خطرہ ہے جو ان کی دینی ہلاکت کا باعث ہو گا۔ لہٰذا حکمت و تدریج کا یہی تقاضا ہے کہ پہلے ظاہری علوم کے اثر سے ان کے دل کی کھیتی کو اس قابل بنایا جائے کہ اس میں یہ قیمتی بیج بویا جا سکے۔

محولہ بالا احادیث سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ علوم دینیہ ظاہری اور باطنی دو حصوں پر مشتمل ہیں جو لوگ فہم سقیم کے باعث باطنی علوم کو دین کا حصہ ہی نہیں سمجھتے در حقیقت وہ دین کو کاملاً سمجھنے سے عاری ہیں اور جو دین کے ظاہر و باطن کو دو الگ الگ راستے(STREAMLINES)خیال کرتے ہیں وہ کم فہمی اور کج فکری کا شکار ہیں کیونکہ باطنی علم نہ تو ظاہری علم کا مخالف ہے اور نہ ہی دین سے باہر کی کوئی شئے۔

بد قسمتی سے ہمارے دور کے بعض علماء دو واضح طبقوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک طبقہ ظاہر و باطن کے لحاظ سے علوم دینیہ کی تقسیم ہی کو غلط خیال کرتا ہے ان لوگوں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مکمل حقیقت دین سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ دوسرے گروہ کے نزدیک علم دین کے ظاہری و باطنی پہلو تو ہیں لیکن یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا اور غیر متعلق ہیں ان کے خیال میں ظاہری علم علماء کا حصہ ہے جبکہ باطنی علم عرفاء و صوفیاء کی میراث۔ در اصل مؤخر الذکر گروہ بھی مکمل حقیقت سے نا آشنا ہے اور بقول حضرت امام مالک" یہ لوگ ظاہر و باطن کو جدا کرنے کے باعث فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں۔ یا زندیق تک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ظاہری و باطنی علوم یا دوسرے لفظوں میں علم الاحکام اور علم الاخلاص یا علم التصوف کو جمع کرنا ہی راہ ہدایت ہے جس کے نتیجے میں ظاہری اعمال و افعال قرآن و سنت کی ظاہری تعلیم کے مطابق ڈھل کر درست ہوتے ہیں اور قرآن و سنت کی باطنی تعلیم کے ذریعے تزکیہ و تصفیہ حاصل ہو جاتا ہے اس موقف کی وحی الٰہی سے بھی تائید ہوتی ہے۔ جب قرآن حکیم نبی اکرم ﷺ کے فرائض نبوت کو یوں بیان فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ	تحقیق اللہ رب العزت نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول ﷺ مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیات تلاوت فرماتا اور انہیں

ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ○ (آل عمران، ۳: ۱۶۴)

پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

یہاں فرائض نبوت میں تلاوت آیات اور تعلیم کتاب و حکمت' کے ساتھ ایک چوتھی چیز کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے اور وہ ہے تجلیۂ قلب تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن۔ جو شے فرائض نبوت کا ایک مستقل حصہ ہے اور قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر فرائض نبوت کے حوالے سے مذکور ہے اسے کوئی صاحب ایمان دین سے خارج قرار نہیں دے سکتا۔ بلکہ ہر مومن بارگاہ رسالت میں ہاتھ پھیلائے صدا کناں ہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
میرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے

علمی و دینی نقطۂ نظر سے تصوف کی ضرورت واہمیت ثابت و آشکار ہو چکی ہے اب ہم عملی اور اعتقادی نقطہ نظر سے تصوف کی ضرورت واہمیت پر بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

باب چہارم

مطالعہ تصوف کی عملی واخلاقی ضرورت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ امر بدیہی ہے کہ ایک اچھا معاشرہ اچھے افراد ہی سے تشکیل پاتا ہے۔ اگر افراد صالح سیرت و کردار کے زیور سے آراستہ ہوں گے تقویٰ اور صالحیت ان کے کردار کی نمایاں خصوصیات ہوں گی تو ایسے افراد کے اجتماع سے ایک نیک صالح اور مثالی معاشرہ وجود میں آئے گا اور اگر افراد کمزور' بودی اور کھوکھلی سیرتوں کے مالک ہوں گے تو ان کی شخصیتیں تقویٰ' پرہیزگاری' ایثار و قربانی' عاجزی وانکساری اور ہمت وجرأت سے عاری ہوں گی تو ایسے افراد سے صالح اور کامیاب معاشرہ کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔ اسلام کا مقصد روئے زمین پر ایک صالح اور مثالی معاشرہ قائم کرنا ہے جبکہ مثالی معاشرے کا قیام صالح اور مثالی افراد کے وجود پر منحصر ہے صالح اور مثالی سیرتوں کی تعمیر میں تصوف کیا کردار ادا کرتا ہے؟ یہی ہمارا موضوع بحث ہے تعمیر سیرت کے حوالے سے ہم تعلیمات تصوف کو حسب ذیل دو اعتبارات سے تقسیم کرتے ہیں۔

۱: تصوف بحیثیت تزکیہ نفس

۲: تصوف بلحاظ مذہبی واردات

عملی زندگی کی اصلاح تزکیۂ نفس سے ہوتی ہے جبکہ اعتقادی زندگی کی اصلاح تصوف کی مذہبی واردات پر منحصر ہے ان دونوں امور پر قرآن حکیم وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔

تصوف کی عملی ضرورت

حیات انسانی متنوع پہلوؤں سے تشکیل پاتی ہے جن میں سے ایک اہم پہلو 'نفسی' ہے جو شعور اور لاشعور کے باہمی تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ 'نفسی پہلو شخصیت کی

وہ خشت اول ہے جس کے درست اور اصلاح یافتہ ہوئے بغیر انسانی زندگی کی عمارت صالحیت کی بنیادوں پر نہیں اٹھ سکتی اور نہ ہی حیات انسانی کو جادۂ صالحیت میسر آ سکتا ہے۔

اللہ رب العزت کا منشأ یہ ہے کہ اس کے محبوب رحمت عالم ﷺ کی امت پر مشتمل جو معاشرہ معرض وجود میں آئے وہ سرتاپا صالحیت و تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہو۔ اسی لئے اللہ سبحانہ نے سرکار دو عالم ﷺ کے رفقاء اور غلاموں کی یہ صفات عظمیٰ بیان فرمائیں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا

(الفتح، ۲۹:۴۸)

محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور وہ لوگ جو آپ (ﷺ) کے ساتھ ہیں وہ کفار پر بڑے سخت ہیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحم دل ہیں تو انہیں دیکھے گا کبھی رکوع کی حالت میں اور کبھی سجدے کی حالت میں وہ ہمیشہ اللہ رب العزت سے اس کے فضل اور اس کی رضا کے چاہنے والے ہیں۔

یعنی جو مومنین محمد مصطفیٰ ﷺ پر پروانہ وار نثار ہیں اور اپنے آقا ﷺ کے پرتو جمال سے مستنیر ہیں۔ آپ ﷺ کی اتباع سے خود کو شرف انسانیت سے مرصع کر رہے ہیں۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں پر تختی اور قہر الٰہی بن کر ٹوٹتے ہیں اور **الحب فی اللّٰہ و البغض فی اللّٰہ** کی عملی تصویر ہیں۔ کافروں سے نرمی کا برتاؤ کرنا یا ان کے ظاہری جاہ و جلال سے مرعوب ہونا ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ دوسری طرف ان میں یہ وصف بھی ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کے لئے پیکر رحمت اور سراپا محبت بن جاتے ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

وہ جلال و جمال کا حسین شاہکار ہوتے ہیں۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ان میں تیسری صفت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ رزم گاہ حیات سے فارغ ہو کر راتوں کو خلوت گزیں ہوتے ہیں۔ تو قرآن سن سن کران کی آنکھیں تر ہو جاتی ہیں اٹھتے بیٹھتے پہلوؤں کے بل لیٹے اور رکوع و سجود کے اندر ذکر محبوب میں مگن نظر آتے ہیں۔ اس کے حضور چپکے چپکے دعائیں اور التجائیں کرتے ہیں۔ ان کو دشمنی اور نفرت ہوتی ہے تو صرف اللہ کے دشمنوں سے اور محبت ہوتی ہے۔ تو صرف اللہ کے پیاروں سے ان کی انفسی، قولی اور عملی نفرت و محبت بھی عبادت الٰہی بن جاتی ہے اور ان کے ذکر و فکر کا مقصود بھی محبوب حقیقی کی رضا ہوتی ہے۔ انہیں معلم کائنات ﷺ نے بتا دیا ہے کہ ہمارا پروردگار ان بندوں پر راضی ہوتا ہے۔ جن کی سیرت میں یہ تین باتیں پائی جائیں۔

دراصل یہ ایمان ہے جو فطرت کے اندر یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ انسان کسی سے دشمنی و نفرت رکھے تو صرف اللہ کی خاطر اور اگر محبت و دوستی یا نرمی کا برتاؤ کرے تو وہ بھی صرف اللہ کی خاطر۔ وہ عبادت میں وقت گزارے تو اللہ کی خاطر، یہاں تک کہ دوزخ کا خوف یا جنت کی طلب بھی اس لگن کا باعث نہ ہو وہ مفاد اور غرض کی تمام آلائشوں سے پاک ہو کر صرف اپنے رب کو منانے، راضی کرنے اور اس سے مضبوط تعلق استوار کرنے کے لئے ہر لحہ سراپا جہاد بن جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر یہ صفت کس طرح پیدا ہو کہ اس کا فکر و تخیل اور ہر قول و فعل اس ایک مرکز و محور کے گرد گھومنا شروع کر دے اس کا سادہ سا جواب تو یہی ہے کہ انسان ہر ماسوی اللہ سے لاتعلق ہو کر اور نفع و ضرر کے تمام

تصورات کو بالائے طاق رکھ کر ہر قول و عمل محض رضائے الٰہی کے لئے کرے۔ دوستی ہو یا دشمنی، کسی سے جڑنا ہو یا کٹنا ہو، جینا ہو یا مرنا ہو، سب کچھ اس حقیقت کے سانچے میں ڈھل جائے کہ۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○
(الانعام، ۶: ۱۶۳)

حق یہ ہے کہ میری نماز، میری قربانی میری زندگی اور میری موت صرف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پرودگار ہے۔

اور پھر وہ ہر طرف سے کٹ کر، ہر فکر و خیال اور فلسفہ و نظریہ کے طلسم سے آزاد ہو کر صرف اللہ کا ہو جائے اس کا فکر و خیال اور فلسفہ و نظریہ صرف ایک جہت میں مرکوز ہو جائے وہ قولاً اور عملاً صرف اللہ کا ہو کر رہ جائے اور یہی کیفیت تعلق باللہ کا حقیقی تقاضا ہے بفحوائے آیت قرآنی:۔

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ○
(الانعام، ۶: ۷۹)

میں نے تو اپنا منہ اسی ذات کی طرف یکسو ہو کر کر لیا۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اس کی مثال سورج مکھی کے پھول کی طرح ہو جائے کہ جس طرف سورج اپنی ضیا بار شعاعیں برساتا ہے اس کا منہ اسی طرف ہوتا ہے اور یوں جیسے جیسے سورج کا رخ بدلتا چلا جاتا ہے کہ

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

قرآن حکیم نے ہمارے لئے زندگی کے تمام اقوال و افعال کا مرکز و محور متعین کر دیا اور وہ ہے۔ "طلب رضائے الٰہی" یہی وہ نقطہ ماسکہ ہے جس کے گرد گھومنے سے سیرتوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ صالحیت، تقویٰ، جوانمردی، ایثار و قربانی، شخصیت کے زیور بن جاتے ہیں۔ جب افراد سنور جاتے ہیں تو ایک اچھا معاشرہ وجود میں آتا ہے

جو افراد کے لئے جنت نظیر ہوتا ہے۔

معاشرے کی اس عملی ضرورت کو صرف تصوف ہی پورا کر سکتا ہے صالح عملی زندگی تزکیۂ نفس پر ہی استوار ہوتی ہے۔ عملی زندگی کا رخ انفسی پہلو کی کیفیات متعین کرتی ہیں اور یہ انفسی پہلو دو امور سے عبارت ہے۔

۱: شعور ۲: لاشعور

شعور اور لاشعور کے تقاضے

شعور کی سطح پر اکثر و بیشتر تمرد، سرکشی نافرمانی، انحراف اور احکام الٰہی سے روگردانی و خلاف ورزی کے جذبات غالب رہتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کا غلبہ بھی شعور کی سطح پر ہوتا ہے اور احکام و قیود سے روگردانی کے جتنے رجحانات و میلانات ہیں ان کا اثر اور اس کے اثر کے عملی مظاہر بھی شعور کی سطح تک ہی ہوتے ہیں۔ اسی لئے ایام طفولیت کو دور معصومیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں شعور بیدار نہیں ہوتا، لاشعور کا غلبہ ہوتا ہے لہٰذا انحراف و تمرد یا سرکشی کا کوئی سبب نہیں ہوتا اور پھر جوں جوں موسم شباب آتا ہے لاشعور دبتا چلا جاتا ہے اور اسی قدر خلاف ورزی، نافرمانی، انحراف اور سرکشی و بدی کے میلانات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

انسانی زندگی کا انفسی پہلو لاشعور کے باہمی تضاد اور باہمی تعلق سے عبارت ہے یہ حقیقت مستحضر رہنی چاہیئے کہ حیات انسانی میں شعور اور لاشعور کے تقاضوں میں تضاد ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ ہر دور میں ایک تصادم اور تصادف کی کیفیت قائم رہتی ہے۔ شعور کی قوتیں آدمی کو بدی کی طرف کھینچتی ہیں۔ جبکہ لاشعور (ضمیر) کے تقاضے نیکی کی طرف لے جاتے ہیں۔ زندگی کے انفسی پہلو میں یہ تقاضے ہمیشہ ایک جنگ کی کیفیت قائم رکھتے ہیں اللہ سبحانہ نے انسان کے اندر نیکی اور بدی دونوں کے کرنے کا ملکہ، قدرت اور صلاحیت ودیعت کی ہے اور ان دو پر ہی فطرت انسانی کے حوالے سے بیان کرنا چاہیں تو ہمارے پاس دو جامع اصطلاحیں موجود ہیں۔

۱۔ فطرت بالقوہ　　　لاشعور

۲۔ فطرت بالفعل　　　شعور

گویا فطرت بالقوہ کے تقاضے وہی ہیں جنہیں ہم لاشعور کا تقاضائے خیر کہتے ہیں ور فطرت بالفعل کے تقاضے وہ ہیں جن کو ہم نے شعور کا تقاضائے شر قرار دیا ہے۔ ان دونوں کے مابین ہمہ قوت تضاد، تصادم اور ٹکراؤ کی کیفیت قائم رہتی ہے اور جب تک یہ تضاد و تصادم قائم رہے انسانی شخصیت معرض کار زار بن کر مختل، پریشان اور پراگندہ رہتی ہے۔ شخصیت کے اندرونی طور پر منتشر ہونے کے باعث سکون و اطمینان ناپید رہتا ہے۔ اگر شخصیت کے اندر تقاضائے خیر اور تقاضائے شر کے مابین موافقت اور سازگاری پیدا ہو جائے اور اسے سکون و راحت میسر آ جائے تو شخصیت میں استحکام اور وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ موافقت کیسے پیدا ہو کہ شخصیت کو راحت اور سکون میسر آئے تاکہ یہ وحدت و استحکام سے ہمکنار ہو سکے اس کی ممکنہ صورتیں دو ہی ہیں۔

۱۔ یہ کہ شعور کے تقاضے یا تقاضاہائے شر، لاشعور کے تقاضوں یا تقاضاہائے خیر کے تابع ہو جائیں۔

۲۔ یہ کہ لاشعور کے تقاضے، تقاضاہائے خیر، شعور کے تقاضوں یعنی تقاضاہائے شر کے تابع ہو جائیں۔

تصادم دونوں صورتوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ صورت اول کے واقع ہونے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ شخصیت کا رخ تقویٰ اور پرہیز گاری کی جانب ہو گا اور وہ صالحیت کے سانچے میں ڈھل کر مکمل ہو جائے گی۔ جبکہ صورت ثانی واقع ہو تو انسان فسق و فجور کے راستے پر گامزن ہو گا اور شخصیت بدی و شر کے سانچے میں ڈھل کر اپنے مقصد تخلیق سے دور جا پڑے گی۔

ایک اچھے معاشرے اور اچھی فکر کا تقاضا یہ ہے کہ صورت اول کے قیام کے لئے جدوجہد کی جائے۔ اگر شعور کے تقاضے لاشعور کے تقاضوں کے تابع ہو جائیں تو

اولاً شخصیت کا اندرونی تصادم ختم ہو جائے گا اور ثانیاً شخصیت صالحیت اور تقویٰ کے سانچے میں ڈھل کر مثبت رخ پر رفعت و عظمت کی طرف گامزن ہو گی۔ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** کے ناپیدا کنار معانی کے تناظر میں دیکھا جائے تو شخصیت میں صالحیت پیدا کرنے اور پھر صالحیت کو شان استقامت سے ہمکنار کرنے کا مقصد تقاضا کرتا ہے کہ انفسی پہلو میں لاشعور کا تقاضائے نیکی غالب آجائے اور شعور کا تقاضائے بدی ہمیشہ کے لئے دب کر مغلوب ہو جائے۔

اصلاح نفس

شعور کے تقاضائے شر کو لاشعور کے تقاضائے خیر کے تابع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے اس (نفس) کی اصلاح کی جائے جو شعور کو پوری قوت اور شد و مد کے ساتھ "سوء" یعنی بدی پر اکساتا ہے کیونکہ شعور کے تقاضائے بدی کی تمام تر قوتوں کا سرچشمہ "نفس" ہے۔

جب تک نفس انسانی شر پر اکسانے والی حیثیت و خاصیت پر قائم رہے گا اس وقت تک بدستور اور بہ تسلسل شعور کو شر پر اکساتا رہے گا اور شعور کا تقاضائے شر کبھی کمزور نہ ہونے پائے گا' جب تک شعور کا تقاضائے شر' نفس کی گرفت میں ہے۔ اس وقت تک لاشعور کا تقاضائے نیکی طاقتور نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کے غلبے کی کوئی سبیل پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ حقیقت شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ لاشعور کے تقاضوں کو شعور کے تقاضوں پر غالب کرنے کے لئے' نفس کی اصلاح لازمی ولابدی ہے جو شعور کو برائی کی قوت' احساس اور جستجو فراہم کرتا ہے اس نفس کی خاصیت قرآن حکیم نے یوں بیان فرمائی ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ بے شک نفس تو برائی کا ہی حکم دیتا ہے۔

(یوسف' ۱۲: ۵۳)

نفس پوری قوت اور اصرار کے ساتھ برائی کی طرف رغبت دلاتا ہے اور انسانی زندگی کا یہ المیہ ہے کہ اکثر بدنصیب انسان اس نفس کی آفتوں سے آگاہ نہیں۔ اندریں حالات نفس کے ساتھ جہاد کر کے اس کا تزکیہ کرنا لازم ہے ورنہ شعور کی برائی پر اکسانے والی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑ سکتی اور شعور پر برائی کی گرفت ڈھیلی ہوئے بغیر لاشعور کی تقاضائے خیر کی گرفت کبھی مضبوط نہیں ہو سکتی۔

پس تزکیۂ نفس کے ذریعے لاشعور کے تقاضائے خیر کو غالب کرنا ضروری ہے تاکہ مقصودِ دین حاصل ہو اور فرد کی سیرت صالحیت کے سانچے میں ڈھل کر ایک اچھا اور صالح معاشرہ وجود میں لانے کا باعث ہو۔

تزکیۂ نفس کا مقام

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تزکیۂ نفس کی خود وضاحت فرمائی کیونکہ فرائض نبوت میں تلاوت آیات تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کے ساتھ ساتھ عمل تزکیہ' بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض میں سے ہے۔ قرآن حکیم نے نفس کے باب میں تنبیہاً واطلاعاً یہ وضاحت کی کہ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا ○ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا ○

(الشمس' ۹۱: ۹۔ ۱۰)

یقیناً فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں دبا دیا۔

دوسرے مقام پر ارشاد ربانی یوں ہے کہ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ○ وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ○

(الاعلیٰ' ۸۷: ۱۴۔ ۱۵)

بے شک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کر لیا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور پھر نماز پڑھتا رہا۔

ان آیات سے مترشح ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس' ذکرِ الٰہی اور نماز سے بھی مقدم

ہے نفس کو گناہ کی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک کرنا مقدم ہے تاکہ جب انسان نفس مزکی کے ساتھ نماز اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو تو اسے بے ذوق سجدوں سے نجات مل جائے اسے ان عبادات کا حقیقی لطف و سرور حاصل ہو جائے اور اس کی کیفیات واحوال اس قدر بدل جائیں کہ سجدے کے بعد اس کے ہر بن موئے تن یہ صدا نکلے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اور پھر اس کی نماز کو وہ کیفیت واحسان' عطا کی جائے گی جس کے دو درجات کی وضاحت سرکار دو عالم ﷺ نے یوں فرما دی۔

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک
(صحیح بخاری' ۱:۱۲)

کہ تو اللہ کی عبادت کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے تو (یہ کیفیت ضرور مستولی رہے) کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

جو بھی خواہشات نفس کی اکساہٹوں اور آلودگیوں سے پاک ہو کر محبوب حقیقی کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو جائے اللہ سبحانہ اس کے باطن کو اپنے انوار و تجلیات سے منور و متجلی فرما دیتے ہیں اور اس کی روحانی کیفیتیں اسے مقام حضوری تک لے جاتی ہیں۔ سیدنا امام حسن بصری ؒ فرماتے ہیں کہ

قد افلح من زکی نفسہ و حملھا علی طاعۃ اللّٰہ
(معالم التنزیل علی ھامش الخازن' ۸:۲۱۰)

تحقیق وہ فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا اور اسے اللہ کی اطاعت پر برانگیختہ کیا۔

جہاد بالنفس میں امام موصوف نے حصول تزکیہ کو کامیابی ٹھہرایا ہے اور یہ وہ حقیقی کامیابی ہے جو آدمی کو اسی دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے ایک غزوہ سے واپسی پر نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

مرحبا بکم قدمتم من الجھاد تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے

الاصغر الی الجهاد الاکبر قیل و ماالجهاد الاکبر یا رسول الله قال جهاد النفس	ہو عرض کی گئی یا رسول اللہ! جہاد اکبر کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نفس کے ساتھ جہاد کرنا۔

(بیہقی فی شعب الایمان)

گویا جہاد عمومی کے جہاد اصغر اور جہاد بالنفس کے جہاد اکبر ہونے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود مہر تصدیق ثبت فرمائی۔ قرآن حکیم نے جہاد بالنفس کے لئے مرد مومن کو دو شمشیریں عطا کی ہیں۔

۱: جلالت رب کی ہیبت

۲: نہی عن الھواء

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى	اور جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا ہوگا اور اپنے نفس کو ہر بری خواہش سے روکتا رہا ہوگا تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہوگا۔
(النازعات' ۷۹: ۴۰-۴۱)	

گویا جس نے نفس کو خواہشات کی آلودگیوں سے پاک کر لیا اس کے لئے جنت کا مژدہ جانفزا ہے کیونکہ اس نے مقصد حیات کو پا لیا اور نفس جیسے بدخواہ اور رہزن کی چالوں سے بچتا ہوا صراط مستقیم پر گامزن رہا اور اس طرح منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب نفس انسانی میں کوئی برائی فروغ نہ پا سکے۔ ماسوی اللہ کی کوئی شئے اس کو نہ بھکا سکے مادی زندگی کی رعنائیاں اس کے جذبات میں ارتعاش وہیجان پیدا نہ کر سکیں تو یہ وہ کیفیت ہے جسے تزکیہ نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش وکاوش کا نام عمل تزکیہ ہے اس کی مثال کچھ یوں ہے جیسے کوئی شخص ایک کیاری میں خوشبو دار پودینہ لگائے تو پودینے کے پودوں کے ساتھ کچھ اور خود رو جڑی بوٹیاں بھی اگ آتی ہیں جن کا اگانا مقصود نہیں ہوتا اور ان کا رہنا چنداں مفید نہیں ہوتا بلکہ سراسر نقصان دہ اور ضرر رساں ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی اسی

کیاری سے اپنی قوت نمو پاتی ہیں۔ جس کی تمام قوت صرف اور صرف پودینے ہی کو ملنی چاہئے۔ اس کے باعث زمین کی قوت تخلیق کا ایک بڑا حصہ غیر ضروری پودوں کی نشوونما میں ضائع ہو جاتا ہے۔ جس ۔کے باعث پودینے کے پودے صحیح نشوونما نہیں پا سکتے اور مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عاقل و دانا کسان اس کا یہی علاج کرتا ہے کہ غیر ضروری پودوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے تاکہ زمین کی تمام تر قوت تخلیق پودینے کی نشوونما پر صرف ہو۔ پس **نَہَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی** کا معنی غیر ضروری اور مضر پودوں کو اکھاڑ دینا ہے تاکہ تقوی و خیر کے پودے انسانی قوتوں میں موجود تخلیقی محرکات سے قوت نمو پا کر اپنی بہار دکھا سکیں۔

اللہ رب العزت کو صرف تقوٰی' صالحیت اور پرہیزگاری کے پودے پسند ہیں جبکہ بعض لوگ اپنے نفع و نقصان کو سمجھ نہیں پاتے اور خواہشات کی ظاہری شرینی پر فریفتہ ہو کر خواہشات نفسانی کے ضرر رساں پودے لگانے اور انہیں نمو دینے میں غلطاں رہتے ہیں اور تقویٰ و صالحیت کے پودوں کے لگانے کی ضرورت تک محسوس نہیں کرتے ان کی تمام تر تخلیقی قوت خواہشات کو پورا کرنے میں صرف ہوتی ہے نفس کو خوش کرتے رہتے ہیں اور ان کا حال یہ ہوتا ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا○ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا

(الکھف' ۱۸: ۱۰۳-۱۰۴)

تم کو بتائیں کہ کون لوگ اپنے اعمال کے اعتبار سے بالکل گھاٹے میں رہے یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت ہوئی اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ بڑے اچھے کام کر رہے ہیں۔

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ سبحانہ فرماتے ہیں۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ

(الفرقان' ۲۵: ۴۳)

کیا تم نے اس کی حالت پہ غور کیا جس نے اپنی خواہش نفسانی ہی کو اپنا معبود بنا

لیا۔

خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل کو مقصد حیات بنالینا گویا ان خواہشات کو معبود بنالینا ہے جبکہ مقصد تو یہ تھا کہ کشت قلب میں صالحیت و تقوی کی کھیتی لہلہاتی اور خواہشات کی نقصان دہ جڑی بوٹیوں اور جھاڑ جھنکار کو چن چن کر پھینک دیا جاتا۔ کیونکہ یہ نہی النفس عن الهوی کا تقاضا تھا اور اگر یہ تقاضا پورا کیا جاتا تو اس کا ثمرہ۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

(النازعات، ۷۹: ۴۱)

کی صورت میں برآمد ہوتا۔ لیکن شبانی سے کلیمی تک عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک مولائے روم" سے مولوی تک جو فاصلہ ہوتا ہے وہ طے کرنے کے لئے کسی شعیب علیہ السلام، محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یا کسی شمس تبریزی" کا ہونا لازمی ہے کیونکہ یہ مقام اہل اللہ سے متمسک ہوئے بغیر حاصل نہیں ہوپاتا اور نہ قرآن و سنت کی روح تک پہنچنا میسر آسکتا ہے۔ بقول حکیم الامت"

دم عارف نسیم صبحدم ہے
اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

یہی سبب ہے کہ عارف روم نے بکمال جرأت اعتراف کیا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزیؒ نہ شد

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو اللہ سبحانہ صحت احساس عطا فرمادیں اور نفس کی سطح پر انہیں خیر اور شر کا شعور حاصل ہو جائے جب یہ شعور ارزانی ہو جاتا ہے تو نفس امارہ نفس ملہمہ میں بدل جاتا ہے جس کی وضاحت قرآن حکیم نے یوں فرمائی:۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا○ پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو۔

(الشمس ۹۱: ۸)

نفس جب تک امارہ کے مقام پر رہے اس میں خیر کا احساس تک پیدا نہیں ہوتا کیونکہ شر ہر پہلو سے غالب اور مستولی رہتا ہے۔ آدمی کبھی سوچتا بھی نہیں کہ میرے رب کی رحمت مجھے بخشش کے لئے پکار رہی ہے۔ اور اس کا مستحق بننے کے لئے نیکی کا دروازہ کھلا ہوا ہے وہ سب کچھ فراموش کئے رکھتا ہے اگر کوئی خوش نصیب خواہشات نفس کی شرارت سے بچنے لگے تو یہ نفس کی قوت تمیز کے باعث ہوتا ہے اور اسے نفس ملہمہ سے موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نفس ملہمہ نہ صرف صلاحیت امتیاز رکھتا ہے بلکہ اسی عمل امتیاز کے نتیجے میں خیر کی ضرورت کا احساس بھی دلاتا ہے۔

نفس کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ امارہ اور ملہمہ کی منازل عبور کر کے **لوامہ** کے مقام پر فائز ہو جائے۔ رب کائنات کا ارشاد ہے:۔

لَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ○ (القیامہ ۷۵:۲) — ہرگز نہیں! میں قسم کھاتا ہوں۔ ملامت کرنے والے نفس کی۔

نفس کا یہ وہ مقام ہے کہ جب انسان بدی کا قصد کرے۔ برے کام کی طرف راغب ہو، برے راستے پر قدم اٹھانے لگے، ناجائز بات کہنے لگے۔ غیر محمود عمل کرنے لگے یا کسی پر ظلم و زیادتی کا خیال دل میں لائے تو نفس اسے ملامت کرتا ہے نفس لوامہ کی ملامت اس قدر زبردست اور مضبوط ہوتی ہے کہ گویا یہ آدمی کے ہاتھ پکڑ لیتا ہے، زبان مقفل کر دیتا ہے اور پاؤں روک لیتا ہے اور آدمی کو اس (شر) کا ارادہ ترک کرنا ہی پڑتا ہے اور جب نفس لوامہ کی گرفت مضبوط تر ہو جائے تو دل میں (شر) سے نفرت اور خیر سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اس مرحلے پر بدی کے جذبات و داعیات بالکل کچلے جاتے ہیں اور نفس نیکی میں راحت و اطمینان پانے لگتا ہے اور جب نفس اس اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ تو رب کائنات اسے یوں مخاطب فرماتے ہیں:۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ○ **ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً**○ **فَادْخُلِي** — اے نفس مطمئن! واپس چلو اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے

فِیۡ عِبٰدِیۡ ○ وَ ادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ○ (الفجر' ۸۹: ۲۷۔ ۳۰)

راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پس شامل ہو جا میرے خاص بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

یہ نفس کا چوتھا درجہ ہے کہ وہ مطمئنہ کے مقام پر پہنچ جائے جب نفس نیکیوں پر مطمئن ہو کر جم جاتا ہے تو دوریاں سمٹنے لگتی ہیں۔ محبوب حقیقی کے قرب و وصال کی منزلیں قریب سے قریب تر دکھائی دینے لگتی ہیں۔ حضور الوہیت میں حاضری کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کیفیت حضوری مفید تر اور دوام پذیر ہونے لگتی ہے اور پھر خدا بندے کو اپنی دوستی کے حلقے میں شامل کر کے بلانے لگتا ہے کہ اے نفس مطمئنہ! قریب آ جا اور قریب آ جا کہ میں تیری سماعت کو اپنی سماعت بنالوں' تیری بصارت کو اپنی بصارت بنالوں' تیرے بولنے کو اپنا بولنا بنالوں' تیرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ بنالوں اور تجھے وہ مقام دے دوں کہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں' کار کشاد' کار ساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اور پھر تیری خواہش قلب کو گویا اپنی آرزو بنالوں بلکہ تجھے اپنا بنا کر وہ مقام دے دوں کہ

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مجھ سے اتنا قریب ہو جا کہ خالق و مخلوق کا فرق تو باقی رہے لیکن تو اپنی ذات کو میری ذات میں اور اپنے ارادوں کو میرے ارادوں میں یوں گم اور فنا کر دے کہ تیرے اندر (اپنے) ہونے کا احساس باقی نہ رہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

قریب آ جا' اِرۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ اپنے رب کی طرف لوٹ آ' معلوم ہونا چاہئے

کہ رجوع اپنی اصل کی طرف لوٹنے کو کہتے ہیں۔ گویا جب نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہوتا ہے تو محبوب حقیقی اسے نہ صرف قرب ووصال کا مژدہ جانفزا سناتا ہے بلکہ اس پر اس کی اپنی حقیقت کو آشکار کر دیتا ہے۔ کہ تیرا مقام تو یہ دعویٰ کرنے کا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ اے نادان! کہاں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے؟ تیری اصل تو ہماری بارگاہ میں ہے تو ہم سے جدا تھا۔ اب اس قابل ہے کہ ہم سے آملے' لوٹ کر پھر ہماری طرف آجا۔

تیرا یہ رجوع درحقیقت تیری زندگی کا کمال ہے تو اپنی اصل کی طرف رجوع کر اور تمام سمتیں بھول کر صرف ہماری طرف آجا۔ تجھے اپنے رب کا قرب ووصال نصیب ہوگا اس درجے میں پہنچ کر نفس مزید مژدہ ہائے جانفزا کا حق دار بن جاتا ہے یہاں اسے ان کٹھن منزلوں کے طے کرنے پر صلہ دیا جاتا ہے جہاں قدم قدم پر لغزشیں اور شیطانی اکساہٹیں تھیں اور وہ صلہ یہ ہے کہ اسے نفس راضیہ کے مقام پر فائز کر دیا جاتا ہے جو نفس کی منزل کمال کا پانچواں مرحلہ ہے۔

نفس مطمئنہ تو نیکیوں پر راضی ہو گیا تھا لیکن راضیہ کے مقام پر وہ قرب ووصال کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے لذتوں کا یہ سرور اسے مسلسل حالت بے خودی میں رکھتا ہے اور وہ محبوب حقیقی سے جڑ جانے کے باعث دو عالم سے کٹ جاتا ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

جب یہ لذت آشنائی آدمی کے قلب ونظر اور فکر وخیال میں سرور کی کیفیتیں بھر دیتی ہے تو اس کے سامنے دنیا کی تمام لذتیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ لذت آشنائی وہ کیفیت ہے جسے لفظوں کے قفس میں اسیر کرنا ناممکن ہے کیونکہ یہ لطف کہا نہیں جاتا

محسوس کیا جاتا ہے اور محسوس وہی کر سکتا ہے جسے حاصل ہو جائے۔

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد!
ہائے کمبخت ! تو نے پی ہی نہیں

اگر کسی شخص نے تا عمر آم نہیں کھایا' چکھا تک نہیں' کوئی اسے خواہ کتنی فصاحت وبلاغت کے ساتھ تشبیہ واستعارہ سے مرصع جملوں میں آم کی لذت سمجھاتا رہے' انسانی ذہن' مشاہدے اور تجربے کے قریب تر متعارف کرانے کو کوشش کرے ناممکن ہے کہ اسے آم کے ذائقہ کا لطف آسکے ذائقہ کا لطف اسی وقت ممکن ہو گا جب دوسرا آدمی خود اس کے شیریں رس اور گودہ پر اس کی حس ذائقہ فریفتہ ہو جائے گی۔

لذت آشنائی کیا ہے؟ حظ وصل کیا ہے؟ ہجر و فراق میں تڑپنا کیا لطف دیتا ہے؟ یہ کیفیتیں بیان کرنے اور سننے سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ ان حلاوتوں اور لذتوں کو وہی محسوس کرے گا۔ جو مقام آشنائی' تک رسائی حاصل کرے گا۔ یہ توارت کے دھندلکوں میں آرام دہ اور ہمت شکن' شکن در شکن بستروں کو چھوڑ کر اٹھنے والے اور اپنی جبین نیاز کو بارگاہ محبوب میں جھکا کر زاروقطار رونے والے ہی بتا سکتے ہیں کہ راتوں کے سناٹے میں یاد محبوب میں آنسو بہانے کا کیا مزہ ہے؟ وہ مزہ نرم بستروں میں بے خبر سونے سے کہاں حاصل ہوتا ہے؟ یہ لطف و سرور ان بدنصیبوں کے بس کی بات نہیں جو غیر کی خاطر محبوب سے رسم و راہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ محبوب بڑا غیور ہے وہ جانتا ہے کہ نام نہاد عشاق

ہر بوالہوس حسن پرستی شعار کی!

کے زمرے میں آتے ہیں۔ محبوب کا قرب اسی وقت ملتا ہے اور محبت کا حق اسی وقت ادا ہوتا ہے جب آدمی ہر طرف سے کٹ جائے۔ ہرجائی نہ رہے صرف اسی سے واصل ہو' یکجائی ہو جائے۔

حکایت ہے کہ مجنوں صحرا سے گزر رہا تھا اس کی زبان پر لیلیٰ لیلیٰ کا ورد تھا۔ ایک زاہد نماز میں مشغول تھے۔ مجنوں ان کے آگے سے گزر گیا زاہد نے مجنوں کو جا پکڑا

کہ تو نے نمازی کے آگے سے گزر کر کتنا گناہ کیا! مجنوں نے کہا میں لیلیٰ کی یاد میں مست تھا مجھے احساس نہ رہا کہ کوئی نماز پڑھ رہا ہے اور میں اس کے آگے سے گزر گیا' جبکہ تو خدا کی ذات کو یاد کرنے میں مشغول تھا اور تو نے مجھے گزرتے دیکھ لیا! زاہد شرمندہ و نامراد لوٹ آیا۔

جن کے جسم تو نماز کی حرکات و سکنات میں مشغول ہوتے ہیں اور قلب و نظر کچھ اور کرنے میں مشغول ہوتے ہیں انہیں کبھی لذت آشنائی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ تمام دوستیاں چھوڑ کر' دنیا کی لذتوں سے بے نیاز ہو کر' دنیا کی راحتوں سے لاتعلق ہو کر اور دنیا کی محبتوں سے ناطہ توڑ کر محبوب کے جلوہ حسن میں گم ہو کر ہی دیکھا جا سکتا ہے کہ اس کی دوستی میں کیا لذت ہے' اس کے وصال میں کیا مزہ ہے اور اس کے ہجر و فراق میں تڑپنے سے کیا راحت ملتی ہے۔ نفس جب باعتبار کیفیت ایک درجہ مزید حاصل کرتا ہے تو وہ نچلے درجہ کی نیکیوں پر اکتفاء نہیں کرتا کیونکہ اسے نچلے درجہ کی نیکیوں میں مزہ نہیں آتا۔ اسی لئے عرفاء میں یہ قول مشہور ہے۔

حسنات الابرار سیات المقربین — نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین کو اپنے لئے گناہ نظر آتی ہیں۔

ابرار جو نیکیاں کر کے اپنے درجے بلند کرتے ہیں اگر مقربین بھی اسی درجے کی نیکیوں پر اکتفاء کرنے لگیں تو ان کے درجے گھٹنا شروع ہو جاتے ہیں اسی لئے مقربین نچلے درجے کی نیکیوں کو اپنے لئے گناہ سمجھتے ہیں۔ اور اپنے کمال کے اعتبار سے ان پر استغفار کرتے ہیں۔ خود حضور ﷺ روزانہ ستر بار یا سو مرتبہ استغفار کرتے تھے۔ حضور ﷺ تو معصوم عن الخطا ہیں۔ دانستہ تو کیا نادانستہ بھی عمداً تو کیا سہواً بھی آپ ﷺ سے غلطی اور خطا کا کوئی امکان نہیں پھر استغفار کرنا کس لئے تھا؟ یہ دراصل حال گزشتہ سے استغفار اور مستقبل میں بلندی درجات کی دعا تھی بمصداق آیت قرآنی۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (الضحیٰ' ۹۳:۴) — اور بے شک (آپ کی ہر آنے والی گھڑی) پہلی (گھڑی) سے بہتر ہے۔

اگرچہ سرورِ کون و مکاں ﷺ کی ہر ساعت تمام مخلوق کی جملہ ساعتوں سے بہتر اور بلند تر ہے لیکن حضور ﷺ کی اپنی ساعتوں میں ہر آنے والی ساعت پہلی سے بلند تر تھی۔ آپ ﷺ کا استغفار پچھلی حالت کی طرف واپس لوٹنے سے ہوتا تھا۔ اسی طرح اعلیٰ درجے پر پہنچ جانے والا بندہ اپنے گزشتہ مقامات کی طرف واپس لوٹنے سے استغفار کرتا ہے۔

اس مقام پر نفس صرف عمل صالح میں اطمینان نہیں پاتا بلکہ عمل صالح کے ذریعے اطمینان تلاش کرتے کرتے قرب خاص کے مقام پر چلا جاتا ہے اور ضرب کی لذتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے تو (راضی) ہو جاتا ہے۔ یہ لذت ضرب ایسی ہوتی ہے کہ گزشتہ تمام لذتیں اس کے سامنے ہیچ ہوتی ہیں۔ یہاں نفس راضیہ ہو جاتا ہے خوش نصیب اور قابل رشک ہیں وہ لوگ جنہیں یہ مقام حاصل ہو جائے۔

الرسالۃ القشیریہ میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے رب سے پوچھا: اے باری تعالیٰ تیرا سب سے بڑا فضل کیا ہے؟

جواب ملا! مومن پر میرا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ میں اس سے راضی ہو جاؤں۔ عرض کیا یہ کس طرح پتہ چلے کہ آپ بندے سے راضی ہو گئے ہیں فرمایا کہ بندہ اپنے دل پر نظر کرے، اگر اپنے دل کو اللہ پر راضی پائے تو سمجھ لے کہ اللہ اس سے راضی ہے۔ یعنی جب تک بندہ اپنے رب سے راضی نہ ہو رب اس بندے سے راضی نہیں ہوتا اور جب نفس رب سے راضی ہو جائے تو اسے کائنات کی سب سے بڑی نعمت اور شرف و رضائے الٰہی حاصل ہو جاتی ہے گویا جب نفس راضیہ کے درجے پر پہنچتا ہے تو ساتھ ہی اسے مرضیہ کے مقام پر فائز کر دیا جاتا ہے جس کی عظمتوں کا بیان قرآن حکیم نے یوں فرمایا کہ

وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۚ — اور اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے۔

(التوبہ ۹: ۷۲)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ (المائدہ‘ ۵:۱۱۹)	اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

اس مقام پر بندہ اپنے رب کا طالب ہوتا ہے اور رب اپنے بندے کا‘ بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے اور اللہ اپنے بندے سے‘ بندہ خدا کی رضا چاہتا ہے اور خدا اپنے بندے کی‘ یہ مقام راضیہ و مرضیہ ہے جو معراج انسان ہے جہاں طالب و مطلوب محب و محبوب اور منتظر و منتظر کے تعلق کی کیفیت عام لوگوں کو حیرت آشنا کر کے رشک میں ڈال دیتی ہے اور عبد‘ عبدہ کی رفعت شان دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔

عبد دیگر عبدہ چیزے دیگر
ما سراپا انتظار او منتظر

عبد وہ ہے جو اللہ کی مرضی کا انتظار کرتا ہے اور عبدہ وہ ہے جس کی مرضی کا اللہ انتظار کرتا ہے یہ وہ مقام ہے جس کا ذکر حدیث قدسی میں یوں فرمایا گیا:

لایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببته فکنت سمعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به کنت یده التی یبطش بها و رجله التی یمشی بها وان سالنی لاعطینه و لئن استعاذنی لاعیذنه (صحیح بخاری‘ ۲: ۹۶۳)	میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں۔ پس میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں ہر صورت اس کو عطا کرتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ طلب کرے تو میں اسے ہر صورت پناہ دیتا ہوں۔

یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس بندے نے سب کی رضاؤں سے منہ توڑ کر صرف رضائے الٰہی کو اپنا مقصود زندگی بنالیا۔ اللہ سبحانہ اپنے ایسے بندے کو مخلوق میں ذلیل نہیں ہونے دیتے بلکہ معزز کر دکھاتے ہیں اور اس کی مرضی کو پورا فرمادیتے ہیں۔

پروردگار عالم کی شان کریمی تو یہ ہے کہ جو بندے اس سے منہ موڑے ہوئے ہیں انہیں بھی مطلقاً نظرانداز نہیں کرتا' اپنی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا اور جو اس کی طرف ایک قدم بڑھے وہ اس کی طرف ستر قدم بڑھتا ہے اس کے کرم کا تو یہ عالم ہے کہ بندے بستروں میں غافل پڑے ہوتے ہیں اور وہ آسمان دنیا پر نزول فرماکر کہتا ہے اے غافلو! ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں۔ ہے کوئی بخشش طلب کرنے والا کہ میں اس کو بخش دوں۔

جو بندے اللہ سے غافل ہیں جب وہ انہیں بھی نظرانداز نہیں کرتا تو جنہوں نے اس کی خاطر ساری کائنات کو نظرانداز کردیا سب سے توڑ کر رب سے جوڑی سب سے ٹوٹ کر رب کے ہو گئے' بھلا رب کریم کا کرم یہ کیسے گوارا کرے گا کہ اس کا ایسا بندہ لوگوں میں ذلیل ہو جائے' اس کی بات پوری نہ ہو رب تعالیٰ اس کی بات کو ضرور پورا فرمادیتے ہیں کیونکہ یہ اس کا وہ وارفتہ بندہ ہے۔ جو ہر حال میں اپنے رب سے راضی ہے اور رب کریم اس سے راضی ہے اب یہ نفس مرضیہ سے بھی ترقی کر کے نفس کاملہ بن جاتا ہے جس کے متعلق اللہ جل مجدہ نے ارشاد فرمایا:

اِرۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ۝ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ۝ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ۝ (الفجر' ۸۹: ۲۸۔۳۰)	اپنے رب کی طرف لوٹ اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی۔ پھر میرے محبوب بندوں میں شامل ہو جا۔ اور میری جنت میں آ جا۔

نفس مرضیہ کا مقام تزکیۂ نفس کا چھٹا درجہ ہے اور جب یہ مقام اپنی تکمیل شان کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے تو بندہ کے جنت میں مقام بلند کے راستے کھل جاتے ہیں۔ عبد تو وہ پہلے تھا ہی اب عبدہ کا مقام حاصل ہو گیا اس لئے اب وہ نفس کاملہ ہے

اور یہ تزکیہ نفس کا ساتواں اور آخری درجہ ہے۔

حضرت مولانا روم ؒ اس فرق کو یوں واضح فرماتے ہیں کہ ایک شخص اللہ سبحانہ سے شکوہ کر رہا تھا کہ اے باری تعالیٰ! اس بادشاہ کے غلام کتنی سج دھج اور عیش و سکون سے رہتے ہیں کہ انہیں کوئی تکلیف نہیں حالانکہ وہ غلام صرف بادشاہ کے ہیں اور میں تیرا بندہ ہوں لیکن ہر وقت مصیبتوں میں مبتلا رہتا ہوں۔ تجھے اپنے بندوں کو پالنے کا سلیقہ نہیں آتا تو اپنے بندے اس بادشاہ کے حوالے کر دے۔ چند روز گزرے کہ اس بادشاہ کے ملک پر کسی دوسرے بادشاہ نے حملہ کر دیا۔ جب حملہ آور بادشاہ سارے ملک کو تہس نہس کرتا ہوا دارالخلافہ تک پہنچ گیا تو بادشاہ ایک تہہ خانے میں چھپ گیا اس کے سارے غلام اور ملازم گرفتار کر لئے گئے۔ اور انہیں اذیتیں دے دے کر پوچھا گیا کہ اپنے بادشاہ کا پتہ بتاؤ۔ اگر اسے گرفتار کروا دو تو ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔ غلاموں نے کہا کہ ہم نے مالک کے ٹکڑے کھائے ہیں۔ اگر آپ سر سے پاؤں تک بھی ہمارے جسموں کو کچل ڈالیں تب بھی ہم اس کا پتہ نہیں بتائیں گے ہم خود تکلیفیں اٹھالیں گے لیکن اسے کوئی گزند نہ پہنچنے دیں گے۔

مولانا روم ؒ فرماتے ہیں کہ اے اپنے مالک و خالق کا شکوہ کرنے والے! تو بندہ بننے کا سلیقہ اس بادشاہ کے غلاموں سے سیکھ۔ جب تجھے بندہ بن کر رہنا آجائے تو اس وقت رب کریم کی شان کریمی کے کرشمے بھی تیرے سامنے آجائیں گے۔ شکوہ تو اپنا کرنا چاہئے کہ ہم بندے کیوں نہ بنے۔

جب آدمی خالص بندہ اور عبدہ بن جائے' تزکیہ نفس کے ساتوں مراحل طے کرتا ہوا نفس کو تمام تر آلودگیوں سے پاک کرے۔ قرب کی منزلوں کو چھو لے تو اللہ کی عنایات و نوازشات بندے پر یوں برستی ہیں کہ ساری کائنات اس کی تعظیم بجالاتی ہے اور وہ بندہ خود کو مسجود ملائک ہونے کا حقدار ثابت کر دیتا ہے۔ وہ جس سمت نظر اٹھاتا ہے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ وہ دعائیں کرتا ہے تو اس کی دعائیں قبولیت کا سہرا پاتی ہیں ،کیونکہ وہ اللہ کا اور اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

اس باب کا خلاصہ بحث یہ ہے کہ جب انسان تزکیۂ نفس کے تمام مراحل طے کر کے لاشعور کی نیکی کو غالب اور شعور کی بدی کو مغلوب کر لیتا ہے تو وہ بظاہر عام انسانوں کی طرح ہی نظر آتا ہے لیکن اس کا قلب و باطن شخصیت اور زمین و آسماں اس کے لئے بدل چکے ہوتے ہیں۔ اس کی حقیقت عام انسانوں سے مختلف اور نہایت ارفع واعلیٰ ہوتی ہے۔

تزکیۂ نفس دراصل نتیجہ ہے اس تعلیم کی تعمیل کا جو قرآن و سنت میں ہر جگہ ہے اور جسے اصطلاحاً تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا تزکیۂ نفس کی ساری تگ و دو تصوف ہے تصوف کی تعلیمات کی معرفت فہم اور ان پر عمل کئے بغیر تزکیۂ نفس کے مراحل طے نہیں ہوتے اور جب تک تزکیۂ نفس حاصل نہ ہو جائے انسان نہ اپنے مقصد زیست کو پا سکتا ہے اور نہ ہی خلیفۃ اللہ فی الارض کا عملاً اہل ہو سکتا ہے۔

انداز بیاں گرچہ کچھ شوخ نہیں ہے
شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے مری بات

○

باب پنجم

مطالعہ تصوف کی اعتقادی اور

سائنسی ضرورت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مطالعہ تصوف کی اعتقادی اور سائنسی ضرورت کیا ہے؟ اس زاویہ نگاہ سے تصوف کی ضرورت کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں مذہبی و دینی حالات کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ اپنی روزمرہ زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا اعتقاد متزلزل ہے عقائد کی پختگی اور ایمان کے رسوخ کی جو کیفیت ہمارے اسلاف میں تھی اس میں روز بروز تنزل اور بے کیفی طاری ہو رہی ہے نوجوان نسل اسلامی عقائد و نظریات سے دامن چھڑانے میں کوشاں ہے۔ شعائرِ اسلام اور دینی معاملات سے جو دلچسپی اور شغف پرانے لوگوں کو تھا' وہ موجودہ نسل میں مفقود ہے۔ خود دینی و روحانی خانوادوں کی اولاد میں دین اور روحانیت کا اثر برائے نام نظر آتا ہے اور اس طرح ہم امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ دینی اور روحانی اقدار سے بے گانہ ہوتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ نوجوان نسل میں تو کسی حد تک دین سے انحراف اور اسلامی تعلیمات سے بغاوت و نفرت کی فضا بھی نظر آتی ہے۔ یہ صورت احوال دینی و روحانی زوال کی عکاسی کرتی ہے۔

دوسرا پہلو اعتقادی و عملی زندگی کا تضاد بلکہ تصادم ہے اور یہ پہلو بھی ہر طرف محیط نظر آتا ہے۔ امت کے بڑے حصے میں اعتقاد و عمل کے مضامین میں ہم آہنگی اور سازگاری کی فضا باقی نہیں رہی۔ ہم جو کچھ مانتے ہیں ہمارے قلوب اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ دین کی اساسیات پر ایمان کا دعویٰ اور اخلاق و روحانیت کی اعلیٰ اقدار سے شیفتگی کے زبانی و مجلسی مظاہر تو ضرور نظر آتے ہیں لیکن یہ سب کچھ مسجد یا مذہبی مجلسوں تک محدود ہے جبکہ زندگی کے عملی معاملات میں جو بازار' عدالت' گھر' سکول اور کاروبار سے متعلق ہیں ان میں ہم عملاً ان تمام ایمانیات اور اقدار کا عملی انکار کر دیتے ہیں اور اس طرح دین سے ہماری شیفتگی کی حقیقت کا تعین کرنے والے زیر لب مسکرا

دیتے ہیں۔

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی!

گویا جن باتوں کو ماننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا ہم اقرار باللسان کرتے ہیں ان کی تصدیق بالعمل کی بجائے تکذیب بالعمل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ' قول وفعل کا یہ تضاد عوام الناس کی زندگیوں میں ہی نہیں بلکہ "خواص" کی عملی زندگیوں میں بھی نہایت واضح نظر آتا ہے۔ جو لوگ رہنمائی کی مسندوں پر براجمان ہیں' امت کے مقتداء ہونے کا عملاً ادعا رکھتے ہیں۔ اور بظاہر ان کا لحہ لحہ تبلیغ دین متین کے لئے وقف ہے وہ بھی قول وفعل کے تضاد میں عوام سے آگے نہیں تو پیچھے بھی ہرگز نہیں ہیں۔ ان کی خوش رنگ اور خوشنما تقریریں' دل کو لبھانے والے خلوص وللہیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اقوال دراصل وہ خواب ہوتے ہیں جن کی تعبیریں ان سے برہم ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ تکمیل مقاصد کی مستور تدبیریں ہوتی ہیں جن سے تقدیریں بھی خفاء ہوتی ہیں۔ ان کا اپنا عمل اس شعر کے مصداق ہوتا ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

یہ ایک عملی حقیقت ہے کہ عوام پر رہنمایان دین کے کردار وعمل کا گہرا اثر ہوتا ہے جب یہ لوگ اپنے مقام ومرتبہ سے نیچے گرتے ہیں تو عوام کی نظر میں ان کا وجود کرچی کرچی ہو جاتا ہے' ان کی توقیر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ خود اپنی عزت وتوقیر کو' اپنے جوہر قابل کو چند مادی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اور یہ کائناتی حقیقت ان پر نافذ ہو جاتی ہے کہ

و من لا یکرم نفسہ لا یکرم

رہنمایان دین کے اس رویے کے نتیجے میں دینی اقدار ہمہ گیر زوال کا شکار ہو جاتی ہیں جس کی عملی صورت ہمارے سامنے ہے اور اس صورت حال کا سب سے زیادہ CREDIT اسی طبقے کو جاتا ہے بقول شخصے

و ما افسد الدین الا الملوک
و احبار سوء و رہبانہا

کیا ہم نے کبھی عقیدہ و عمل کے اس تضاد پر غور کیا ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بات پر توجہ دی کہ دینی اور اخلاقی روحانی اقدار سے ہماری زندگی کیوں دور ہوتی جارہی ہے؟ ضرورت تو یہ تھی کہ اس زوال کے اسباب و محرکات پر درد دل اور سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جاتا۔ اور مریض سے نفرت کی بجائے مرض سے نفرت کی جاتی اس کا علاج کرنے کی سعی بلیغ کی جاتی لیکن ہم نے وطیرہ یہ اپنایا کہ جہاں کہیں یہ تضاد نظر آیا' مرض کی خوفناک صورت سامنے آئی ہم نے مریض ہی کو فاسق وفاجر اور بے دین و بد عمل قرار دے کر خود کو مریض سے سبکدوش کرلیا اور مطمئن ہو بیٹھے۔

ہم نوجوان نسل کو دین سے گریزاں دیکھتے ہیں کہ وہ ایمانی اخلاقی اور روحانی اقدار سے بے گانہ ہے۔ دین پر عمل پیرا ہونے کی جو تڑپ ان میں نظر آنی چاہئے تھی وہ مفقود ہے تو ہم انہیں ناقابل توجہ سمجھتے ہوئے یہ کہہ کر رد کردیتے ہیں کہ یہ لوگ دین سے دور جارہے ہیں۔ دین کے باغی ہیں' انہیں دین سے عناد ہے اور یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ایسی باتیں بناکر ہم بزعم خویش یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم دین کا دفاع کررہے ہیں کماحقہ' اس کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ اور ہمیں دین کی بڑی تڑپ ہے۔ حالانکہ اس رویہ سے نہ تو دین اور روحانیت سے بیزار ہونے والوں کو اخلاقی اور روحانی اقدار کی طرف واپس لایا جاسکتا ہے اور نہ ہی عمل واعتقاد کے تضاد کو ختم کیا جاسکتا ہے اگر ہمیں دینی اقدار سے واقعتاً محبت ہے اور ان کی ترویج کی امنگ ہے تو ہمیں نہایت سنجیدگی اور مثبت انداز فکر کے ساتھ تعصب کی عینک اتار کر تمام صورت حال پر غور کرنا ہوگا اور اس کے اسباب کا کھوج لگانا ہوگا کہ کن تدابیر سے اس بے راہ روی کا مداوا کیا جاسکتا ہے۔

عملی واعتقادی زوال اور اس کے اسباب

زوال' پریشانی' ابتلاء اور دین سے بغاوت کی جو صورت ہمیں نظر آرہی ہے

اس کے اسباب وعلل کا کھوج لگا کر علاج کی تدابیر کرنے کے لئے یہ حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ انسانی زندگی کا نظام تین بنیادوں پر استوار ہے۔

۱: اعتقاد

۲: علم

۳: عمل

اور ان تینوں کے مجموعے کا نام دین ہے۔ جب زندگی حقیقی طور پر ان تینوں کے تمام تقاضے پورے کردے اسی وقت وہ ایک متوازن دینی زندگی کہلانے کی حقدار ہے۔

۱۔ عقائد وہ نظری تعینات ہیں جن کو کسی خارجی ذریعے سے جان کر یا اندرونی سطح پر سوچ بچار کر کے انسان اپنے دل میں جاگزیں کرلیتا ہے اور پھر ذہن ان پر اس قدر جم جاتا ہے کہ وہ نظریات سے بڑھ کر یقینیات کا درجہ حاصل کرلیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ خدا ایک ہے وہ سب کا خالق ومالک اور پروردگار ہے۔ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء اور رسل کو مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعے ہم پر واضح کردیا کہ موت کے بعد ہر انسان دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا قیامت آئے گی اور اس دن میزان قائم ہوگی جس میں ہمارے تمام اقوال وافعال کی مثبت اور منفی قدر متعین ہو جائے گی اور پھر اس پر جزا وسزا کا فیصلہ ہوگا جس کے نتیجے میں کوئی محمود ہوگا اور جنت میں جگہ پائے گا اور کوئی مذموم ہوگا اور جہنم کے حوالے کیا جائے گا۔ ہر نفس کو اس کے کیے کا صلہ ملے گا۔ یہ وہ نظری تعینات ہیں جن پر پختہ یقین کر لینے کو اعتقاد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہی اجزائے ایمان ہیں اور انہیں کو اساسی ایمانیات سے تعبیر کیا جاتا ہے مختلف مذاہب میں عقائد بھی کلی طور پر یا جزئی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہم اعتقاد کی بنیاد قرآن وسنت کی تعلیمات پر رکھتے ہیں۔ جبکہ دیگر مذاہب کے لوگ اپنی مذہبی کتابوں کی تعلیمات کے مطابق عقائد اختیار کرتے ہیں کسی کا عقیدہ موروثی ہوتا ہے۔ کسی کا علمی

وجہ البصیرت اگرچہ یہ بصیرت بھی اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتی ہے۔

الغرض ہر انسان کچھ مخصوص اور مستقل نظری تعینات پر یقین رکھتا ہے۔ جو اس کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں اور پھر یہی یقین اعتقاد سے موسوم ہوتا ہے۔

۲۔ نظام حیات کی دوسری بنیاد علم ہے۔ علم حاصل کرنے کے کچھ ذرائع ہیں انسان جب عالم رنگ و بو میں قدم رکھتا ہے تو اسے بتدریج حواس نصیب ہوتے ہیں وہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، سونگھتا ہے، چھوتا ہے اور چکھتا ہے ان متنوع ذرائع سے اسے شعور کا خام مواد میسر آتا ہے۔ اس خام مواد کو ڈھالنے کا سانچہ یعنی عقل بھی قدرت نے عطا فرمائی ہے ان ادراکات و حواسات کے ذریعے جو خام مواد عقل کے سانچے میں منتقل کیا جاتا ہے۔ عقل اسے ایک خاص شکل عطا کرتی ہے اور وہ خاص شکل اس پیمانے پر عطا کی جاتی ہے جن پر خود سانچۂ عقل ڈھالا گیا ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر عقل کے سانچہ میں جو معیارات اور پیمانے ہوتے ہیں انہی پر ان ادراکات کو جانچ کر ان کا درست اور جائز مقام انہیں دیا جاتا ہے اور اس شکل میں جو معلومات متعین ہو جاتی ہیں انہیں علم کا نام دیا جاتا ہے۔

علم کی بنیاد عام طور پر مشاہدات، تجربات اور ادراکات پر ہوتی ہے۔ گویا علم ایک محل عمل (Forum) ہے جو دنیا میں قدم رکھنے کے بعد انسان کو تجربات، ادراکات اور مشاہدات کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے۔

"اعتقاد" کسی ہستی، طاقت، واقع یا حقیقت کو مان کر دل و دماغ میں جاگزیں کر لیتا ہے۔ اس طرح انسانی زندگی میں ایک قوت عقیدے کی ہوتی ہے اور دوسری علم کی جو مشاھدات و تجربات کی صورت میں انسان کو حاصل ہوتا ہے گویا عقیدہ مقدم ہے اور علم موخر۔ اگر علم عقیدے کی درستی پر مہر تصدیق ثبت کر دے تو عقیدے کو پختگی نصیب ہو جاتی ہے اور پھر اسی پختہ بنیاد پر عمل کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

۳۔ عمل در حقیقت عقیدہ و علم کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اگر بدقسمتی سے عقیدہ و علم میں تضاد واقع ہو جائے۔ علم جو کہ ادراک و مشاہدہ سے استوار ہوتا ہے عقیدے کو مضبوط نہ کر رہا ہو بلکہ علمی سطح پر شک و ریب کی آندھیاں عقیدے کی بنیادیں ہلا کر

رکھ دیں تو عقیدے کی فصیل میں دراڑیں پڑجاتی ہیں۔ بصیرتوں کی حقیقت اس عقیدے کی کفیل نہیں ہوتی آدمی ہر قدم پر سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ اس کے اندر تشکیک و بے یقینی کی کیفیات ایک طوفان برپا کردیتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ میں نے یہ سمجھ رکھا تھا جبکہ مشاہدہ اس کے الٹ نتائج دے رہا ہے۔ میرا عقیدہ یہ تھا جبکہ تجربہ و مشاہدہ اس کی تصدیق سے گریزاں ہے۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ اہل حق دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو ہوتے ہیں لیکن علم و مشاہدہ ثابت کر رہا ہے کہ حق کا نام لینے والے ناکامیوں اور نامرادیوں میں گھرے ہوئے دنیا میں ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں جبکہ اس کے برعکس باطل کے علمبردار اور کفریہ عقائد کے معتقد دنیا میں کامیاب و کامران ہیں۔

اس مرحلے پر پہنچتے ہی آدمی کے ذہن میں خلش پیدا ہوتی ہے کہ میرے عقیدہ یا علم و مشاہدہ میں سے ایک چیز درست نہیں ہے ورنہ ان میں تضاد واقع نہ ہوتا۔ عقیدے کو اس نے دیکھا نہیں ہوتا بلکہ صرف مانا ہوتا ہے جبکہ علم تجربات و مشاہدات سے وضع ہوتا ہے لہٰذا علم و مشاہدہ کے مابین اس ٹکر سے عقیدہ کمزور اور بے جان ہوتا چلا جاتا ہے جو فرد کی عملی زندگی کو بے یقینی کی ضربوں سے تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے کیونکہ عمل میں عقیدہ کی برقی رو ہوتی ہے تو وہ جگمگاتا ہے اور جب عقیدہ جو کہ عمل کی بنیاد ہے کھوکھلا ہو تو عمل بھی فصیل ریگ ثابت ہوتا ہے جب عقیدہ اختیار کیا جاتا ہے تو اولاً اللہ کے خالق و مالک ہونے کا پختہ یقین دل میں جاگزیں ہوتا ہے' اطاعت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ بندگی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ جوں جوں ایمان پختہ ہوتا چلا جاتا ہے توں توں ایمان کی پختگی بندے کو اطاعت کے لئے تیار کرتی جاتی ہے اب اللہ کو جو کچھ مان کر اس نے عقیدہ قائم کیا ہے اگر عملی زندگی میں اس کے ثمرات کا مشاہدہ نہ کرے تو عقیدہ و علم میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اطاعت الٰہی اور نیک اعمال کا جذبہ مرجھا جاتا ہے اور اس کی حالت گل خزاں رسیدہ کی سی ہو جاتی ہے جو حسن کی رعنائی اور خوشبو کی دلاویزی دونوں سے عاری ہوتا ہے جب عقیدہ ہی گل خزاں دیدہ و آفت رسیدہ ہو تو اس میں سے نیک اعمال کی خوشبو اور حسن کیسے جلوہ گر ہو سکتے ہیں جبکہ عمل

کی قوت محرکہ صرف عقیدہ ہے جو خود جاں بلب ہوتا ہے۔

ہمارے عقائد کی کیفیت

جزاء و سزا جنت و دوزخ انجام خیر اور انجام شر ہمارا عقیدہ ہے لیکن عام طور پر مشاہدہ میں یہ آیا ہے کہ ہر اچھے کام کا انجام اچھا نہیں ہوتا اور ہر برے کام کا انجام برا نہیں ہوتا۔ یہ محض ہماری نظر کا فریب ہوتا ہے کیونکہ جن کاموں کو ہم اچھا یا برا سمجھتے ہیں اور جن نتائج کو ہم انجام کہتے ہیں وہ بھی ہمارا خیال ہوتا ہے جس کو ہم عقیدہ بنا لیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب مشاہدہ اس عقیدے کی تصدیق نہیں کرتا تو ہمارا عمل دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں عقیدہ کی بنیاد ایمان بالغیب ہے یعنی ہم حقیقت نفس الامری کو بن دیکھے تسلیم کرتے ہیں۔

ارشاد ربانی ہے:۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ — وہ جو بغیر دیکھے ایمان لاتے ہیں۔

(البقرہ ۲:۳)

چنانچہ ہم نے نہ دیکھا ذات باری تعالیٰ کو نہ آقائے دوجہاں ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے نہ نزول قرآن کو دیکھا یا محسوس کیا' نہ فرشتوں کو آستانہ رسول ﷺ پر حاضری دیتے ہوئے دیکھا نہ ہم نے جنت اور دوزخ' حشر و نشر' حساب وکتاب اور میزان و صراط کو دیکھا لیکن ان تمام امور کو ہم صرف اس لئے مان رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا۔ اس ہستی کے بتانے پر ہم یہ سب کچھ مان رہے ہیں حالانکہ ہم نے خود اس ہستی کو بھی نہیں دیکھا صرف آپ ﷺ کے ارشادات کتابوں کے ذریعے نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچے۔ اور اسی طرح گویا ہمارے تمام تر عقائد کی استواری ایمان بالغیب پر ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک عام آدمی کا عقیدہ بھی "غیب" پر ہی ہوگا' جسے عمل کی دنیا

میں متحقق کرنے کے لئے اسے تصدیق کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اب اگر اس کی عملی زندگی میں عقیدے کی تصدیق نہ کرے بلکہ تکذیب کر ڈالے تو عقیدہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جائے گا اس کے برعکس اگر ان دیکھی حقیقتیں مشاہدے کی گرفت میں آجائیں انہیں تجرباتی توثیق مل جائے ان کا ذائقہ چکھنا نصیب ہو جائے' ان کا لطف و سرور' ادراک و مشاہدہ میں آنے لگ جائے تو رفتہ رفتہ عقیدہ کو پختگی نصیب ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ اعمال کا قوی ترین محرک بن جائے گا اور یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ عقیدہ میں جتنی شدت ہو عمل میں اسی قدر اتقان اور پختگی ہوتی ہے۔

آج کا تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کے باعث خدا اور رسول کا انکار تو نہیں کرتا کیونکہ سماجی دباؤ' شرم اور ڈر لاحق ہے لیکن در اصل وہ بری طرح بے یقینی کا شکار ہو چکا ہے اس کے لئے یہ تمام عقائد چیستان ہیں اور اس کا دل ان سے انکار کرنے پر مجبور ہے وہ آخرت' جنت و دوزخ اور حساب و کتاب سے منکر نہیں لیکن اگر اللہ کی ذات اس کے دل کی کیفیتیں چیر کر دکھا دے تو ہزاروں ایسے نوجوان مل جائیں گے جو زبان سے تو قیامت کا انکار نہیں کرتے لیکن ان کے دل قیامت اور آخرت کے انکار سے مسموم ہیں وہ زبان سے اللہ اور رسول ﷺ کو وراثت اور خارجی دباؤ کے باعث ماننے پر مجبور ہیں لیکن ان کے دل سراپا استفہام ہیں۔ خدا اور رسول ﷺ کو نہ مانیں تو کیوں مانیں؟ سبب یہ کہ اللہ اور رسول ﷺ کو ماننے کا کوئی اچھا اور امید افزا نتیجہ انہوں نے ابھی تک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

یہ سوال کہ اس زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد یعنی موت کے بعد کیا ہوگا' یہ بات ابھی پس پردہ ہے' غیب میں ہے بالکل اسی طرح' جیسے پہلے ایمان بالغیب تھا جب پہلے ایمان بالغیب کی عملی تصدیق و توثیق انہیں نظر نہ آئی تو بعد والے ایمان بالغیب کی تصدیق تو اس زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی۔ اگر اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی جائے کہ تصدیق یہاں نہیں ہوتی تو نہ سہی مرنے کے بعد سب ثمرات مشاہدہ میں آ جائیں گے تو وہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ جن امور پر پہلے ایمان لایا تھا ان کا تو

کوئی نتیجہ نظر نہ آیا۔ مرنے کے بعد کسی اچھے نتیجہ کے سامنے آنے کی امید کس بنیاد پر قائم کی جائے؟ اندریں حالات انسان کے دل و دماغ پر ایک الجھن' ایک تضاد' ایک فساد' ایک ہنگامہ اور شک و ریب کا ایک طوفان برپا رہتا ہے اس کا دل' ایمان بالغیب کے لئے مجبور کرتا ہے جب کہ دماغ کوئی ثمرہ اور نتیجہ نہ پا کر ایمان لانے کو بے معنی قرار دیتا ہے۔ دل اصرار کرتا ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانا جائے' دماغ استفسار کرتا ہے کیوں؟ دل کہتا ہے خیر و شر میں امتیاز کر اور خیر کو ترجیح دے دماغ کہتا ہے نیکی و بدی کے جھگڑوں میں پڑنے والے آج ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں۔

اسی طرح دل و دماغ کے مابین ایک مسلسل جدل و مناظرہ جاری رہتا ہے۔ عقیدۂ و عمل کے مابین تضاد کی کیفیت قائم رہتی ہے۔ یہی عقیدے اور مشاہدے کا تضاد ہے' ایمان اور عمل کا تضاد ہے' اعتقاد اور ادراک کا تضاد ہے' جو دینی و روحانی قدروں پر سے اعتماد و ایقان کو متزلزل کر دیتا ہے۔

آج یہی تضاد و تصادم کی کیفیتیں انسانی زندگی کو عمل کی بنیاد فراہم کر رہی ہیں جس کا نتیجہ عمل میں کجی بھی ہے اور ناپائیداری بھی۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یہی وجہ ہے کہ ہم زبان سے تو ایمان کا انکار نہیں کرتے لیکن عمل سے بزبان حال ان خاص عقائد کا انکار کر رہے ہیں جن پر ہمارے نظام زندگی کی بنیادیں استوار ہیں۔ جو بات دل میں ہے وہ زبان پر تو نہیں آتی لیکن عمل اس کا اظہار کر دیتا ہے ہم ایمان کے دعویٰ کے ساتھ ساتھ جب کذب و افتراء کے مرتکب ہوتے ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سچ کی افادیت پر ہمارا اعتقاد نہیں۔

ہم یہ تو کہتے ہیں کہ عملاً بھی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی اختیار کرو لیکن ہمارا اپنا عمل ہمارے قول کی تردید کرتا ہے ہم زبان سے تو انکار نہیں کرتے لیکن

ہمارے دل میں پوشیدہ انکار کو ہمارا عمل بے نقاب کر دیتا ہے ہماری منافقت کو ہمارے سامنے لے آتا ہے ہمارا عمل بزبان حال پکار پکار کر ہمیں بے نقاب کرتا ہے کہ یہ انسان منافق ہے' زبان سے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان و محبت کا دعوٰی کرتا ہے جبکہ اس کا دل تکذیب کرتا ہے جو عمل میں در آتی ہے۔ عمل کہتا ہے کہ جو بات اس کی زبان پر نہیں آتی وہ مجھ سے ظاہر ہو رہی ہے۔ عقیدے اور عمل کا یہی تضاد ہے جو انسانی زندگی کو عملی لحاظ سے درست سمت میں چلنے سے روک دیتا ہے۔

عقیدہ جب تک عمل کا روپ نہ دھارے وہ اک لاشہ بے جان ہے۔ اس کی حقیقت وہم سے زیادہ نہیں۔ بظاہر یہ ایمان ہو کہ خدا وحدہ لاشریک ہے ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے لیکن لاکھ بار اس کا اظہار کرنے کے باوجود یہ ایمان متحقق نہیں ہوتا تا آنکہ یہ عقیدہ ہمیں عملاً اللہ کے سوا ہر کسی کے خوف سے بے نیاز نہ کر دے اس وقت تک یہ ایک وہم ہے جس کا کوئی اثر ہمیں عملی زندگی میں محسوس نہیں ہوتا۔

ہر کہ رمز لا الٰہ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اگر ایمان باللہ متحقق ہو جائے' انسان کے قلب و نظر میں اور جسم کی نس نس میں رچ بس جائے تو ممکن نہیں کہ انسان کے اندر کسی اور کے خوف کا یا اس سے امید کا شائبہ بھی پیدا ہو سکے۔ جس نے توحید کی اس رمز کو پا لیا اس نے شرک کی حقیقت کو بھی پا لیا۔ ہم ایک طرف تو توحید کا اثبات اور شرک کا رد کرتے ہیں لیکن دوسری طرف قدم قدم پر سرمایہ و دولت' جاہ و منصب اور قوت و جبروت سے ڈرتے ہیں' خدا کے سوا ہر چیز سے ڈرتے ہیں اگر خوف نہیں تو صرف خدا کا نہیں اور پھر شرک کا ابطال اور رد بھی کئے جا رہے ہیں تو کہاں رہا عقیدہ اور کہاں قوت عقیدہ؟

ان حقائق کو سامنے پا کر ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ جس عقیدے کا اثر ہماری عملی زندگی پر نہ ہو۔ جو عقیدہ ہمارے احوال نہ بدل دے' کیفیات نہ بدل دے

اس عقیدے کو وہم کے سوا کیا نام دیں گے؟ اگر ہمارے عقیدہ کا اثر عمل پر نظر نہیں آتا تو ہماری حد تک ہمارے عقیدے اور دیگر اہل مذاہب کے عقائد میں کچھ فرق نہیں جن کے ہاں عقائد وہ مقدس اور جامد خیالات ہیں جن کو ماننے کی ضرورت صرف اس لئے ہے کہ ایک خاص معاشرے یا مذہب کے ساتھ وابستہ رہا جا سکے۔

کچھ خاص عقائد کو وہ بھی مانتے ہیں' ہم بھی مانتے ہیں۔ نہ ان کا ماننا ان کی زندگی میں کوئی انقلاب برپا کر رہا ہے نہ ہی ہمارا ماننا ہماری زندگیوں میں کوئی انقلاب برپا کرتا ہے۔ عقیدہ یا ایمان اس وقت زندہ قوت بنتا ہے جب وہ عمل کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور یہی قوتیں ہیں جو انسانی زندگی کے رخ اور احوال کو متعین کرتی ہیں۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ سائنسی دور ہے کوئی سائنس پڑھے یا نہ پڑھے لیکن آج لوگ توہمات کے چنگل سے خاصی حد تک آزاد ہو چکے ہیں۔ لوگوں کا زاویہ نگاہ سائنسی ہو چکا ہے بالخصوص معاشرہ کا ذہین طبقہ ہر بات پر کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ کے سوالات وارد کر دیتا ہے۔ آج ہر دل میں یہ خواہش تڑپتی ہے کہ جو اسے سنایا جائے دکھایا بھی جائے اور جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے اس کی حقیقت بھی جان لے' اگر انسان نے کوئی چیز دیکھی نہیں تو اس کا سمجھ میں نہ آنا اور بات ہے لیکن دیکھی ہوئی چیز کو مشاہدے کے خلاف ماننا ذرا مشکل سی بات ہے اور جو بات مشاہدے کے مطابق ہو اس کا ماننا آسان ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگر کوئی سائنس دان دعوی کرتا ہے تو تجربات کی روشنی میں اسے سچا کر دکھانے کا بھی پابند ہے ورنہ اس کا دعوی بے معنی ہو جاتا ہے۔

آج سائنس دانوں کا دعوی ہے کہ ہائیڈروجن (HYDROGEN) اور آکسیجن (OXYGEN) دو گیسیں ہیں۔ اگر ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کا ایک ایٹم لے کر ان کے درمیان سے برقی رو گزاری جائے تو یہ دونوں ایٹم پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں جب تک یہ بات محض دعوی کے درجہ میں تھی کوئی اسے ماننے کے لئے تیار نہ تھا لیکن جب سے سائنسدانوں نے تجربہ گاہ میں اس کو عملاً درست اور حقیقی ثابت کر

دیا تو اس کو ماننے سے کسی کو انکار نہیں۔ اسی طرح کیمسٹری اور بیالوجی میڈیکل کی سائنسیں ہیں اور ساری کی ساری تجربات پر مبنی ہیں جو بات کہی جاتی ہے اسے تجربے سے ثابت کر دیا جاتا ہے جب آنکھ کسی حقیقت کا مشاہدہ کر لے تو پھر انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

آج ایک طرف مادیت کے علمبردار ہیں جو روحانیت کی ہربات کو بے بنیاد اور واہمہ قرار دیتے ہیں اور اپنے ہر دعوٰی کو تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھ کر ثابت کر رہے ہیں اس لئے کہ آج عقل انسانی ہربات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کرنے کی عادی ہو چکی ہے اس لئے اگر آج عقیدہ تجربے کی کسوٹی پر ثابت ہوتا نظر نہ آئے تو عقل اسے کیسے مان لے گی؟ یہ سائنسی دور ہے۔ باتوں کے ردو قبول کا معیار سائنسی طریق کار بن چکا ہے اور آج ہربات تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی سچی یا جھوٹی مانی جا رہی ہے۔

یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اقتصادی اور کاروباری زندگی کے کچھ قواعد اور اصول ہیں اگر ان کو اپنا کر کام کیا جائے گا تو کاروبار میں کامیابی یقینی ہے اور اگر ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان سے ہٹ کر کاروبار کیا جائے گا تو خسارہ لازمی ہے۔ جب کاروباری نقطہ نظر سے ایک اصول کا ضرر یا فائدہ سامنے آجائے تو اس کی اہمیت وافادیت یا ضرر رسانی مسلم ہو جاتی ہے اسی طرح زندگی کا ہر معاملہ تجربات اور مشاہدات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد سچا یا جھوٹا ثابت ہوتا رہتا ہے۔ عقل وہی بات مانتی ہے جو اس کی کسوٹی پر پوری اترے۔ اسی پر یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہ عقیدہ اگر مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی پر پورا نہ اترے اور پھر بھی عقل انسانی اسے مان لے تو حال یہ ہو گا کہ نہ اس عقیدہ کی حقانیت ذہن میں راسخ ہو گی' نہ دل اس پر مطمئن ہو گا اور نہ ہی شعور و آگہی اس عقیدہ کو عزت مآب ٹھہرائے گی نتیجۃً وہ عقیدہ ایک ایمان کی شکل میں تو موجود رہے گا لیکن اس کا اثر ناپید رہے گا۔ اس کے اثر سے کوئی عمل وجود میں نہ آئے گا بلکہ عملاً آدمی شتر بے مہار بن جائے گا پھر وہ کسی بھی نظام اور عقیدہ سے

آزاد ہو گا اس کے عمل کو عقیدہ کے تناظر میں جانچنا درست نہ ہو گا اور ان احوال میں عقل اس عقیدہ کی لایعنیت پر مہر تصدیق ثبت کر دے گی۔

ان حالات میں آدمی کے عمل کی قدر کا کیا تعین ہو گا؟ عمل کی اہمیت و قدر کو پرکھنے کے لئے عقیدہ ضروری ہے مگر عمل اور عقیدہ میں تو بعد المشرقین ہے! اس صورت میں عمل کو فی نفسہ انسانی فطرت و جبلت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس عمل کا کوئی اثر عقیدہ کی طرف منتقل نہ ہو گا۔

اعتقاد و مشاہدہ اور مرتبۂ ایقان

یہاں ہم سوچنے پر مجبور ہیں کہ آج کے دور میں جو سائنسی انداز نظر و فکر پیدا ہو چکا ہے آیا قرآن حکیم اسے درست قرار دیتا ہے؟ کیا اسلامی فکر اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ عقیدے کی پختگی صرف ایمان سے نہیں بلکہ تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے؟ کیا سائنسی طریق کار اور فکر اسلامی میں ہمیں کوئی مطابقت نظر آتی ہے؟ قرآن حکیم اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے اور سائنسی طریق کار کی درستگی پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ۔

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (البقرہ '۲:۲۶۰) — اے رب! مجھے دکھا دے تو کیونکر مردے جلائے گا۔

یعنی ایمان تو ہے۔ میں اس ایمان کو مشاہدہ و تجربہ کی توثیق دینا چاہتا ہوں۔ جب تیری قدرتوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کرلوں گا تو میرا ایمان یقین سے بدل جائے گا اور علم الیقین کے درجے سے آگے بڑھ کر عین الیقین کا مقام حاصل کرلوں گا۔

چنانچہ اللہ سبحانہ ' نے ابراہیمؑ کو نہ صرف مردہ کو زندہ کر دینے کا عینی مشاہدہ کروا دیا بلکہ ان کے ایمان کو ایقان میں بدلنے کے لئے انہیں زمین و آسمان کی ساری بادشاہی اور اپنی قدرت کے کرشموں کی سیر کرائی۔

وَکَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ لِیَکُوْنَ مِنَ — اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو دکھاتے ہیں ساری بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی

الْمُوْقِنِيْنَ○ (الانعام' ۶:۷۵)

تاکہ وہ "عین الیقین" والوں میں سے ہو جائے۔

تمام حجابات مرتفع کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زمین و آسمان کی بادشاہی کا مشاہدہ عینی کرانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ عین الیقین کے درجے پر پہنچ جائیں' وہ ایمان سے ایقان کی حالت کو پہنچ جائیں' ایمان جب ایقان میں بدلتا ہے تو اس کا سرور وکیف کچھ اور ہوتا ہے۔ ماننا پہلے بھی تھا لیکن اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد ماننا اور کیفیت رکھتا ہے۔ یہ بلند تر اور پختہ تر کیفیت کا نام ہے۔ پروردگار عالم نے فرمایا:

وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ○ (الروم' ۳۰:۴۷)

اور مومنین کی مدد و نصرت ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔

یہ اللہ سبحانہ کا وعدہ ہے جس پر ایمان رکھنا ایمان بالغیب کے درجے میں ہے۔ جب اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور اور کفر کا زور توڑ کر اپنے محبوب ﷺ کو فتح وغلبہ سے نوازا تو ارشاد ہوا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ○ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا○ (النصر' ۱۱۰:۱-۲)

جب اللہ کی مدد آ پہنچے اور فتح نصیب ہو اور آپ لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب نبی اکرم ﷺ اور مومنین نے فتح ونصرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا ظاہر ہے نصرت خداوندی کو ماننے اور اس پر محض ایمان رکھنے اور اس کی مدد کے جلووں سے نظروں کا نور حاصل کرنے اور ایقان کی دولت حاصل کرنے میں بڑا فرق ہے۔

آقائے دوجہاں ﷺ نے نصرت الٰہی دیکھی' فتح وظفر مندی کے باعث لوگوں کو جوق در جوق اسلام کے دامن رحمت میں آتے دیکھا گویا اپنے رب کے وعدوں کے ایفاء کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کر لیا' ایمان کے نتائج دیکھ لئے ایمان تجربی توثیق کا حامل ہو گیا اور درجہ ایقان پر پہنچا تو ارشاد الٰہی ہوا۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ ط اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًاO

(النصر' ۱۱۰:۳)

پس (اس وقت) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ پاکی بیان کیجئے اور اس سے امت کے لئے مغفرت طلب کیجئے بے شک وہ بڑا معاف فرمانے والا (بڑی بخشش والا) ہے۔

یہ تسبیح و تحمید اور استغفار کا حکم دینا اور قبولیت کا مژدہ سنانا مشاہدہ کے بعد کیوں؟ خدا سے معافی چاہنا اور تسبیح و تحمید کرنا تو پہلے بھی ضروری تھا لیکن مشاہدہ کے بعد خدا کی طرف متوجہ ہو جانا اور ضروری ہو تا ہے۔ یہاں بظاہر تو حکم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہے لیکن حقیقتاً یہ تعلیم امت کو دی جارہی ہے اور فرمایا جارہا ہے کہ اے مسلمانو! استغفار تو تم پہلے کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہو لیکن پہلے دل کے ساتھ اس استغفار کا اتنا گہرا ربط و تعلق نہ ہو تا تھا جتنا اب ہے توبہ تم پہلے بھی کرتے تھے لیکن اب توبہ کی کیفیتیں کچھ اور ہیں کہ ادھر انسان توبہ کرتا ہے اور ادھر رب ذوالمنن قبولیت کی نویدیں سنا رہا ہے جب انسان اپنی آنکھ سے ان کیفیتوں کا مشاہدہ کرے۔ اس وقت مشاہدہ سے پیدا ہونے والی کیفیت ایقان کو لفظوں میں کہاں بیان کیا جا سکتا ہے؟ سورہ النصر کی ان آیات سے ثابت ہوا کہ ایمان بالغیب جب مشاہدہ میں آجائے تو وہ ایقان سے بدل جاتا ہے۔

تصوف کیا ہے؟

یہاں تک یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ایمان کی کیفیت کمال یہ ہے کہ اسے مشاہدہ اور تجربہ کی توثیق حاصل ہو جائے اور ساتھ ہی یہ سوال ابھرتا ہے کہ کمال ایمان کی اس کیفیت کو عملاً کس طرح حاصل کیا جائے۔ یعنی اگر کوئی اپنے عقائد و ایمانیات کے نتائج کا اس دنیا میں بچشم سر مشاہدہ کرنا چاہے تو اس کے لئے کیونکر ممکن ہے؟ اگر سائنس دان اپنی تجربہ گاہوں میں اپنے مفروضہ عقائد پر تجربی توثیق حاصل کرنے کے لئے تجربہ اور مشاہدہ کر کے نتائج تک پہنچ جاتے ہیں اور دنیا سے اپنے عقائد کی حقانیت

تسلیم کروالیتے ہیں تو آیا اسلام میں بھی عقائد وایمانیات کے تجربات ومشاہدات کا کوئی نظام ہے؟

اس سوال کا معتمد علیہ جواب یہ ہے کہ کہ اسلام کے اندر باقاعدہ ایسا نظام موجود ہے جو عقائد وایمانیات کے محسوس نتائج سامنے لاتا ہے اور یہ نظام روحانی تجربات ومشاہدات پر مبنی تصوف ہے اس نظام علم وعمل کے تجربہ کار' ماہر اور سائنس دان صوفیائے عظام کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ صرف تصوف ہی مذہبی واردات کی وہ صورت ہے جو تعلیمات اسلامی اور کیفیات ایمانی کا عملی روحانی تجربہ ہے۔ یہی باطنی مشاہدہ کا وہ نظام ہے کہ ایمان بالغیب جب اس کے تدریجی مرحلوں سے گزرتا ہے تو ایقان میں بدل جاتا ہے۔ تصوف ایمان کے لطائف کا وہ سلسلہ ہے جس سے عقائد کی کیفیات کا باطنی مشاہدہ ہوتا ہے تصوف ہی وہ علم ہے جو عقیدہ اور ایمان کی عملی تصدیق کرتا ہے۔

جب تصوف کے ذریعے مشاہدہ عقیدے کی تصدیق کردے تو عین الیقین کے نتیجے میں وہ عمل وجود میں آتا ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت مضمحل نہیں کرسکتی۔

اہل اللہ دراصل خدا کے وہ دوست ہیں جنھوں نے ریاضتوں اور مجاہدوں کے مراحل سے گزر کر حقائق کا مشاہدہ کیا ہوتا ہے۔ اللہ کے لطف وکرم اور اس کی دوستی کا رنگ وہ اپنی زندگی میں دیکھ چکے ہوتے ہیں وہ دنیا کی محبت سے لاتعلق ہوکر اس کی محبت کا نتیجہ اور لطف وسرور اپنی زندگی میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ان کے اعمال کی قوت محرکہ اتنی زبردست ہوتی ہے کہ کائنات کے کروڑوں انسانوں کے عمل میں وہ کیفیت جذب نہیں ہوتی جو ان کے اعمال میں ہوتی ہے ان کا عمل اللہ کے لطف وکرم کے عینی مشاہدہ سے تشکیل پاتا ہے۔ جبکہ عام افراد کا عمل یہ کیفیت نہیں رکھتا ان کا عمل دید پر مبنی ہوتا ہے جبکہ عوام کا عمل شنید پر مبنی ہوتا ہے۔

شاید اسی لئے حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے عوام کو نصیحت کی ہے۔

تیرا امام بے حضور' تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر' ایسے امام سے گزر

تاریخ اسلام کے اکابر رجال نے ان حقائق کی تصدیق کی ہے۔ امام غزالیؒ جو اپنے دور کے عظیم عالم، فلسفی، محقق اور عبقری انسان تھے، جن کا مقابلہ ان کے دور میں کوئی نہ کر سکا۔ جن کو الراسخون فی العلم کا درجہ حاصل تھا، جن کا عمل قابل رشک تھا، علم کے سمندر پی جانے کے باوصف وہ فرماتے ہیں کہ مجھے پھر بھی تلاش حق رہی علوم وفنون سمندروں کی طرح ذہن میں متلاطم تھے لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود دل غیر مطمئن تھے کیونکہ ابھی تک دین کی حقیقت عظمیٰ سے بے خبر تھا میرے دل میں ایک طوفان برپا تھا کہ کس طرح حقیقت تک پہنچوں۔

آپ فرماتے ہیں کہ

"میں علم الکلام والوں کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ آیا تمہارے پاس حق ہے؟ انہوں نے دلائل دیئے تو میں نے کہا کہ میں ان دلائل کو مانتا ہوں لیکن ان دلائل کے ذریعے تو میں حق تک نہیں پہنچ سکا۔ میں فلسفیوں کے پاس گیا جن کے علوم وفنون پر مجھے خود بھی عبور حاصل تھا لیکن وہ بھی میرے واصل بحق ہونے کا باعث بن نہ سکے۔ پھر میں اس زمانہ کے فرقہ باطنیہ کے پاس گیا اور ان سے راہ حق کے متعلق پوچھا (لیکن بے سود) غرض ساری راہیں دیکھ لیں لیکن کہیں بھی مجھے حق نہ مل سکا۔ آخر کار میں صوفیاء کی بارگاہ میں پہنچا ان سے پوچھا کہ حق کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا حق ہماری راہ میں ہے چنانچہ میں نے ان کی راہ کو اپنایا تو حق کو پا لیا۔ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "المنقذ من الضلال" میں فلسفہ وعلم کلام کا جائزہ لینے کے بعد "طرق الصوفیہ" سے پہلے آپ نے "مذہب التعلیم وعائلتہ" کا باب باندھا ہے۔ یہاں اپنے ذاتی احوال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

وکانت حوادث الزمان ومہمات العیال وضرورت المعاش تغیر فی وجہ المراد وتشوش صفوۃ الخلوہ وکان لایصفو لی الحال الا فی	اور حوادثات زمانہ، اولاد کے معاملات اور معاشی مسائل، مراد اور مقصد کے حصول میں رکاوٹ بنتے رہے اور میری تنہائیوں کی صفوت کو مکدر کرتے رہے۔

اوقات متفرقة لكني مع ذالك لا اقطع طمعي منها فتدفعني عنها العوائق، واعود اليها ودمت على ذالك مقدار عشر سنين، وانكشف لي في اثناء هذه الخلوة امور لايمكن احصاؤها، و استقصاؤها والقدر الذي اذكره لينتفع به اني علمت يقينا ان الصوفية هم السالكون بطريق الله تعالى خاصة و ان سيرتهم احسن السير، و طريقهم اصوب الطريق، و اخلاقهم ازكى الاخلاق بل لو جمع عقل العقلاء و حكمة الحكماء وعلم الواقفين على اسرار الشرع من العلماء ليغيروا شياء من سيرهم، و اخلاقهم، و يبدلوه بما هو خير منه، لم يجدوا اليه سبيلا، فان جميع حركاتهم و سكناتهم في ظاهرهم و باطنهم مقتبسة من نور مشكوة النبوة، و ليس وراء نور النبوة على وجه الارض نور يستضاء بها (المنقذ من الضلال:۵۰)

صورتحال یہ ہو گئی کہ مجھے صرف چند ساعتوں کے لئے حالت صفا نصیب ہوتی لیکن اس کے باوجود میں اپنے مقصد کے حصول سے ناامید نہ ہوا۔ حالات مجھے مقصد سے روگرداں کرتے لیکن میں پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تقریبا دس سال میری یہی کیفیت رہی ان صعوبتوں کے دوران مجھ پر ایسے امور منکشف ہوئے جن کا بیان اور احاطہ ممکن ہی نہیں ہے۔ صرف فائدہ کے لئے ان میں سے چند کا ذکر کر دیتا ہوں۔ مجھے یہ یقین ہو گیا کہ صوفیاء کا گروہ ہی وہ گروہ ہے جو خالصتاً اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے پر گامزن ہے ان کی سیرت تمام لوگوں کی سیرت سے بہتر ہے، ان کا راستہ ہی صحیح بہترین راستہ ہے بلکہ اگر تمام عاقلوں کی عقلوں تمام حکماء کی حکمتوں اور رموز شریعت سے واقف علماء کے علم کو جمع کیا جائے تاکہ صوفیاء کی سیرت واخلاق میں کوئی تبدیلی کی جا سکے۔ اور ان کے اخلاق وسیرت کے مقابلے میں بہتر نمونہ پیش کیا جائے تو یہ بات ناممکن ہو گی کیونکہ صوفیاء کے ظاہر وباطن کی تمام

جز ہیں کیونکہ ان کے ذریعے حقائق منکشف ہوتے ہیں اور فیضان نبوت جاری رہتا ہے
نبی اکرم ﷺ غار حرا میں کئی کئی ہفتے تک جا کر خلوت گزیں رہتے تھے جیسا کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اعجاز خلوت کی طرف اشارہ کیا۔

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید
قوم را آئین و حکومت آفرید

حضور ﷺ چالیس چالیس دن تک دنیا سے کٹ کر مراقبہ مشغول رہتے۔ آپ ﷺ کی نظر سوائے اپنے رب کے اور کسی پر نہ ہوتی تھی اس کثرت سے خدا کی یاد میں محو رہنے کے بعد آپ ﷺ کو رویائے صالحہ آنے لگے اور رات کو جو کچھ دیکھتے وہ صبح کو روز روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آجاتا۔ یہیں سے اظہار نبوت کا آغاز ہوتا ہے صوفیائے کرام کو بھی رویائے صالحہ سے اسرار منکشف ہونا شروع ہوتے ہیں چنانچہ جب رویائے صالحہ آدمی کی نگاہوں کو روشن کرنے لگیں تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ فیضان نبوت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

ومن اول الطریقۃ تبتدء المکاشفات والمشاہدات' حتی انھم فی یقظتھم یشاھدون الملائکۃ و ارواح الانبیاء و یسمعون منھم اصواتا و یقتبسون منھم فوائد
(المنقذ من الضلال:۵۰)

طریقت میں ابتداء ہی سے مکاشفات ومشاہدات شروع ہو جاتے ہیں حتی کہ صوفیاء عین حالت بیداری میں ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبہ کی زیارت کرتے ہیں ان کی آوازیں سنتے ہیں اور ان سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔

جب یہ کیفیت ارزانی ہو جائے تو مشاہدے کی بنا پر یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جو ایمانی کیفیات کی تصدیق وتوثیق کرتی ہے جو خوش نصیب اس جادہ حقیقت پر گامزن ہوتے ہیں وہ مشاہدے کے باعث اپنے ایمان بالغیب کو ایقان کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ جو خوش بخت اس کیفیت کو پاتے ہیں ان کی بصیرت سے تمام حجابات مرتفع ہو جاتے

الاخیار تعرف ذالک بالعیان
(المنقذ من الضلال: ۷۵)

و فکر کریں اور اخیار کا مطالعہ کریں تو آپ ان حقائق کو روز روشن کی طرح پہچان لیں گے۔

ثابت ہوا کہ علم حقیقی یا عین الیقین کی کیفیت سوائے تصوف کے اور کسی فلسفہ میں حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ تصوف کے طریقہ میں دل شفاف ہوتے ہیں ذہن مجلی ہوتے ہیں اور وہ روحانی ذوق حاصل ہوتا ہے جو بقول امام"

واما الذوق فھو کالمشاھدۃ والاخذ بالید ولا یوجد الا فی طریق الصوفیۃ
(المنقذ من الضلال: ۵۹)

اور ذوق تو وہ مشاہدہ اور کسی چیز کو ہاتھ میں پکڑ لینے کی طرح ہے اور یہ صرف مسلک صوفیاء میں پایا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ کیفیت ذوق مشاہدہ کے مترادف ہے اور طریق صوفیہ اپنانا گویا ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہے۔ یہ کیفیت سوائے صوفیہ کے کسی کو نصیب نہیں ہوتی امام غزالی" فرماتے ہیں کہ اس کا آغاز سچے خوابوں سے ہوتا ہے چونکہ پہلے نفس غالب تھا (حجابات دبیز تھے) جب نفس کا غلبہ ٹوٹتا ہے تو اسرار منکشف ہونا شروع ہو جاتے ہیں دین وایمان کی وہ کیفیت جو اس سے قبل نظر نہیں آتی تھی وہ نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ جب حجابات مرتفع ہوتے ہیں۔ تو یہ پہلا قدم بھی دراصل براہ راست فیضان نبوت ہوتا ہے۔ رویائے صادقہ سے اسرار منکشف ہوتے ہیں اور یہی رویائے صادقہ ہیں جو حسب ارشاد نبوت' نبوت کا چالیسواں حصہ ہیں بفحوائے ارشاد رسول ﷺ

لم یبق من النبوۃ الا المبشرات قالوا و ما المبشرات یا رسول اللّٰہ قال الرویاء الصالحۃ
(مشکوٰۃ المصابیح' ۲: ۳۴۷-۳۷۵)

نبوت سے المبشرات کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا غرض کہا گیا یا رسول! مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا سچے خواب

یعنی اہل ایمان کے سچے خواب وبشارات ہیں اور اجزائے نبوت کا چالیسواں

جز ہیں کیونکہ ان کے ذریعے حقائق منکشف ہوتے ہیں اور فیضان نبوت جاری رہتا ہے

نبی اکرم ﷺ غار حرا میں کئی کئی ہفتے تک جا کر خلوت گزیں رہتے تھے جیسا کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اعجاز خلوت کی طرف اشارہ کیا۔

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید
قوم را آئین و حکومت آفرید

حضور ﷺ چالیس چالیس دن تک دنیا سے کٹ کر مراقبہ مشغول رہتے۔ آپ ﷺ کی نظر سوائے اپنے رب کے اور کسی پر نہ ہوتی تھی اس کثرت سے خدا کی یاد میں محو رہنے کے بعد آپ ﷺ کو رویائے صالحہ آنے لگے اور رات کو جو کچھ دیکھتے وہ صبح کو روز روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آجاتا۔ یہیں سے اظہار نبوت کا آغاز ہوتا ہے صوفیائے کرام کو بھی رویائے صالحہ سے اسرار منکشف ہونا شروع ہوتے ہیں چنانچہ جب رویائے صالحہ آدمی کی نگاہوں کو روشن کرنے لگیں تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ فیضان نبوت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

ومن اول الطریقۃ تبتدء المکاشفات والمشاہدات' حتی انہم فی یقظتہم یشاہدون الملائکۃ و ارواح الانبیاء و یسمعون منہم اصواتا و یقتبسون منہم فوائد (المنقذ من الضلال: ۵۰)	طریقت میں ابتداء ہی سے مکاشفات ومشاہدات شروع ہو جاتے ہیں حتی کہ صوفیاء عین حالت بیداری میں ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبہ کی زیارت کرتے ہیں ان کی آوازیں سنتے ہیں اور ان سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔

جب یہ کیفیت ارزانی ہو جائے تو مشاہدے کی بنا پر یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جو ایمانی کیفیات کی تصدیق وتوثیق کرتی ہے جو خوش نصیب اس جادہ حقیقت پر گامزن ہوتے ہیں وہ مشاہدے کے باعث اپنے ایمان بالغیب کو ایقان کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ جو خوش بخت اس کیفیت کو پاتے ہیں ان کی بصیرت سے تمام حجابات مرتفع ہو جاتے

ہیں اور وہ براہ راست فیضان مصطفیٰ ﷺ اور دیدار مصطفیٰ ﷺ سے اپنے احوال کو سنوار۔" رہتے ہیں۔ چنانچہ نامور محدث امام جلال الدین سیوطی" (المتوفی:۹۱۱ھ) فرماتے ہیں۔

رایت رسول اللہ ﷺ سبعین مرہ — میں نے (بیداری میں) رسول اللہ کی ستر مرتبہ زیارت کی۔

علمائے حدیث فرماتے ہیں کہ جب ہمیں کسی حدیث کے بارے میں الجھن پیش آتی ہے یا کوئی مسئلہ تمام کتابیں چھان مارنے کے باوجود حل نہیں ہوتا تو ہم آئینہ قلب میں جھانکتے ہیں تو دیدار مصطفیٰ ﷺ نصیب ہو جاتا ہے' تو ہم عرض گزار ہوتے ہیں۔ یارسول اللہ ﷺ! اس معاملہ میں حقیقت کیا ہے؟

انسانی تصور و تخیل ان لوگوں کی کیفیات کو گرفت میں لانے سے عاجز ہیں جو عملی مسائل میں حضور پرنور ﷺ سے رہنمائی لیتے رہتے ہیں ان کی زندگیوں میں علم وعمل اور اعتقاد کی پختگی کا کیا عالم ہوگا!

جو لوگ نبی اکرم ﷺ کی رہنمائی میں حق وباطل اور صواب وناصواب میں امتیاز کرلیتے تھے ان کے فیصلوں اور دوسرے لوگوں کے فیصلوں کی کیفیت یکساں نہیں ہو سکتی صاحب حال کی بات دیدہ ہوتی ہے اور صاحب قال کی بات شنیدہ۔ صاحب حال کا علم سچا اور قطعی ہوتا ہے حتی کہ پروردگار عالم ان کی زبان تک کی حفاظت فرماتے ہیں اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بات کہہ دیں تب بھی اللہ کی ذات ذوالمنن اپنی رحمت وکرم سے اس بات کو پورا کر دیتی ہے۔ اندریں حالات ان لوگوں کے ایمان کی مضبوطی کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

نبی اکرم ﷺ نے ایسے ہی خوش نصیب لوگوں کے بارے میں فرمایا:۔

ان من عباد اللہ لو اقسم علی اللہ لابرہ — اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھالیں تو وہ انہیں سچا کر دیتا ہے۔

(بخاری' ۱:۲۷۲ ۳)

دراصل تصوف کی راہ پر چلنے سے مشاہدے کی قوت حاصل ہوتی ہے اور مشاہدہ حاصل ہونے سے ایمان کو پختگی میسر آتی ہے۔ جب بندہ اس مقام پر پہنچتا ہے تو وہ احوال وکیفیات جن کو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں وہ اس کے لئے ممکن ہو جاتے ہیں۔ جو باتیں محال سمجھی جاتی ہیں وہ اس کے لئے حال ہو جاتی ہیں جو امور مشکل اور دشوار شمار کئے جاتے ہیں وہ اس کے لئے آسان اور سہل ہو جاتے ہیں جن احوال واشیاء کے دیکھنے کا امکان تک نہیں ہوتا بندہ انہیں چشم سر سے دیکھنے لگتا ہے جن باتوں کا سننا ناممکن سمجھا جاتا ہے وہ اپنے کانوں سے سننے لگتا ہے۔ اندریں حالات اس صاحب حال کو ایمان کی جو پختگی نصیب ہوگی وہ صاحب قال کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟

جو لوگ کبھی تصوف کی راہ پر گامزن ہی نہ ہوئے ہوں' مشاہدہ سے کسی علم وعقیدہ کی حقیقت معلوم ہی نہ کی ہو ان کے ایمان میں اہل تصوف کی مانند ایمان کی پختگی آنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تصوف کے علم وعمل میں جو پختگی موجود ہوگی وہ عام لوگوں کے علم وعمل میں نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کا علم عشق کی ایک ہی جست میں تمام کاروانوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے محبوب حقیقی سے واصل ہو جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے۔ کہ اس سائنسی دور میں ایمانیات کو یقینیات کی کیفیت میں رنگنے کے لئے اور ایمان کی حقیقت سے بہرہ ور ہونے کے لئے تصوف کی ضرورت واہمیت پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہے جو لوگ طریق تصوف کو اپنا کر اپنے قلب وباطن کو جلا بخشتے ہیں۔ ان میں وہ بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر نئے پیدا ہونے والے مسئلے کو اپنی باطنی طاقت وبصیرت سے اس کی تہہ تک مشاہدہ کر لیتے ہیں اور انہیں حق وباطل کی راہیں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔

باب ششم

تصوف بنیادی مقاصد کے آئینے میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذشتہ ابواب میں ہم تصوف کی لغوی حقیقت' ترویج اصطلاح اور تصوف کی ضرورت پر بحث کر چکے ہیں۔ اب بتقاضائے ترتیب فطری ہمیں تصوف کا جائزہ اس کی تعلیمات اور مقاصد کے حوالے سے لینا ہے ہمارے دینی وملی اداروں میں ہمہ گیر زوال کے باعث امت پر بدبختی کے سائے منڈلانے لگے تو بدقسمتی سے تصوف کی نسبت بھی لاتعداد غلط فہمیاں کئی افراد کے ذہنوں میں پیدا ہو گئیں جو ان کی (دراصل) کم فہمی کا نتیجہ ہیں اور اپنے سطحی مطالعہ یا سطح بیں واعظوں سے متاثر ہو کر وہ یہ تصور کرنے لگے کہ تصوف ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے یہ اسلام میں درآمدہ رہبانیت ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک تصوف کا مفہوم کچھ ایسا ہی ہے کہ یہ محض جنگلوں اور غاروں میں چلے جانے کا نام ہے کارزار حیات سے کٹ کر بزدلی ونامرادی کو اپنا کر محض گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کئے جانے کا نام ہے گویا تصوف زندگی میں تعطل اور جمود کی تعلیم دیتا ہے بعض لوگوں کا تصور یہ بھی ہے کہ تصوف محض کسی سلسلۂ خانقاہی سے منسلک ہو کر شریعت کی پابندی سے آزاد ہو جانے کا نام ہے کہ نہ مرشد پر کوئی پابندی ہو اور نہ ہی مرید کسی قسم کی حدود وقیود کا پابند ہو۔ ان تمام تصورات کے دو بڑے اسباب ہیں۔

پہلا سبب

دین کے دوسرے اداروں میں زوال کے ساتھ ساتھ خانقاہی نظام میں بھی بے پناہ قباحتیں اور خلاف شریعت امور در آئے۔ سجادہ نشین کا نسل در نسل نظام زوال پذیر ہوتے ہوتے عملاً یہ شکل اختیار کر گیا کہ

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

دوسرا سبب

دوسرا سبب پہلے سبب کا نتیجہ بھی ہے اور خود اپنی جگہ ایک الگ سبب بھی پہلے سبب کے نتیجے میں عوام نے تصوف کو لغو' لایعنی اور مقدس کاروبار' تصور کر لیا اور اسے اس کی تعلیمات ہی کا اثر اور نتیجہ قرار دے لیا اور اس سبب سے یہ لائق التفات نہ رہا۔ جب تصوف کے بارے میں یہ صورت حال سامنے آئی تو دوسرا سبب ایک دینی طبقے کا لوگوں کو دین کی ایسی تعلیم کی طرف بلانا تھا جو تصوف وروحانیت کی چاشنی سے عاری تھی ان نیم خواندہ داعیان اسلام نے اپنے مزعومہ تصور اسلام کو کچھ سائنسی انداز میں اس طرح پیش کیا کہ خانقاہی نظام سے بیزار اور وقت کے بدلتے تقاضوں سے متاثر لوگ اس میں کشش محسوس کرنے لگے جس کے نتیجے میں دین کے ظاہری پہلو پر توجہ بڑھتی چلی گئی اور اس کے باطنی اور روحانی پہلو نظروں سے اوجھل ہو گئے اس صورت حال کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ تعلیمات تصوف اور تصوف کی معرکۃ الآراء کتابوں کو طاق نسیان کی زینت بنا دیا جاتا اور یہی کچھ ہوا۔ لوگوں میں تصوف کے بارے میں معلومات مفقود ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں اور پھر صاحب قال لوگوں نے جیسا کچھ دین کا تصور لوگوں کے سامنے رکھا لوگوں نے اسے قبول کر لیا۔

محسوس یہ ہوتا ہے کہ عوام کے تصوف سے نابلد رہنے میں ان کا کوئی قصور نہیں اس کے ذمہ دار نام نہاد اہل تصوف ہیں یا دین کے متعلق سرسری معلومات رکھنے والے واعظین ہیں۔ جنہوں نے دین کے ظاہر کو لے لیا جو یقیناً اہم تھا اور اسے شائع وذائع کر دیا لیکن اس سے بھی اہم تر دین کے باطنی وروحانی نظام سے صرف نظر کر لیا۔ جس کے نتیجے میں بوعلی سینا تو ضرور پیدا ہوئے لیکن

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے

حقیقت تصوف

درحقیقت تصوف نہ تو جمود وتعطل کا نام ہے' نہ محض کسی سلسلۂ طریقت سے

منسلک ہو جانے اور بزرگوں کے عرس منانے کا نام ہے تمام غلط فہمیاں اور منفی خیالات روح تصوف کو نہ سمجھ سکنے کے باعث پیدا ہوئے۔ تصوف کو غاروں اور جنگلوں میں ذکر وفکر تک محدود کر دینا اس فلسفہ روحانیت کی غلط تعبیر ہے اور اس پر یہ الزام لگانا کہ تصوف زندگی کی حرکت و عمل سے دور لے جانے والا اور زندگی کے بدلتے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکنے والا فلسفہ ہے یہ بھی ناصواب و ناروا ہے۔

دراصل تصوف ایک ایسا جامع ہمہ گیر تصور حیات ہے جو اپنے مقاصد کے اعتبار سے معراج حیات ہے یہ فلسفہ جب کسی کی ذات میں عملاً متحقق ہو جائے تو اسے عروج وکمال سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اگر روح تصوف کا فہم حاصل ہو جائے اور اس کی حقیقی تعلیم سے آگاہی میسر آجائے تو اہل بصیرت کو یہ سمجھنے میں چنداں مشکل نہیں رہتی کہ فلسفۂ تصوف اصلاً چھ بنیادی مقاصد کا مجموعہ ہے جن میں سے تین کا تعلق اعمال سے ہے اور تین کا تعلق احوال سے۔ تین مقاصد عملی مشقت اور جدوجہد کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ دوسرے تین مقاصد کیفیات قلبی اور باطنی سرور پر مبنی ہیں۔

اگر ان کی تفصیل میں جائیں تو مقاصد تصوف کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز ہو جائے گی لیکن یہ سارے کے سارے مقامات واحوال اور تمام تعلیمات کلی اعتبار سے ان چھ مقاصد کے ضمن میں آجاتی ہیں۔

ان چھ مقاصد کو مرحلہ وار مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

مرحلۂ اولیٰ

۱۔ تزکیۂ نفس

۲۔ صفائے قلب

۳۔ اطاعتِ حق

مرحلۂ ثانیہ

۱۔ محبت الٰہی

۲۔ رضائے الٰہی

۳۔ معرفت الٰہی

گویا اگر یہ چھ مقاصد متحقق ہو جائیں تو تصوف کی راہ میں سالک کی پوری جدوجہد اپنی تکمیل اور کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مقصد اور تعلیم و فلسفہ نہ تو حرکت و عمل اور انقلاب کے منافی ہے اور نہ ہی جمود و تعطل کی تعلیم پر مبنی ہے۔ کوئی ایک مقصد بھی ایسا نہیں جس میں جنگلوں اور غاروں میں زندگی برباد کر دینے کا تصور ہو یا رسم و رواج اور بے جان خانقاہی نظام سے چمٹ جانے کی تعلیم ہو۔ تصوف کی جدوجہد کا نقطۂ آغاز تزکیۂ نفس ہے اس سے قبل ہم تصوف کی عملی و روحانی ضرورت کے زیر عنوان اس موضوع پر بحث کر چکے ہیں یہاں بغرض استحضار اس بحث کا اجمالی خلاصہ پیش کرنا مفید مطلب ہوگا۔

۱۔ تزکیۂ نفس

تزکیۂ نفس جو تصوف کی زندگی کا پہلا قدم ہے انسانی زندگی کو اپنے من کی تمام آلائشوں اور کدورتوں سے پاک کر دینے کا نام ہے گویا تصوف کا نقطۂ آغاز تقاضا کرتا ہے کہ نفس انسانی کذب و دروغ گوئی سے پاک ہو جائے' ریاکاری اور منافقت جیسے رذائل دور ہو جائیں' کبر و نخوت اور غرور و تکبر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے' حسد و کینہ اور بغض و عناد کا خاتمہ ہو جائے دنیا کی محبت اور لالچ سے انسانی قلب پاک ہو جائے اور ان رذائل کی جگہ عجز و انکسار خشوع و خضوع تذلل و تواضع نفع بخشی و فیض رسانی' فہم و ذکاء اور جود و سخاء اور محبت الٰہی جیسے فضائل انسان کے قلب و باطن کو منور کر دیں اور انسان کا نفس ہر قسم کے رذائل کا انکار کرے اور ان سے بیگانگی محسوس کرے۔ جب انسان کا قلب و باطن پاک ہو جائے تو اس کا زاویۂ نظر بھی بدل جاتا ہے۔

تزکیۂ نفس کا مقصود یہ ہے کہ انسان دوسروں کو خود سے بہتر تصور کرے اگر کوئی چھوٹا ہو تو اسے اس لئے خود سے بہتر سمجھے کہ اس کی عمر کم ہے لہٰذا اس نے مجھ سے کم گناہ کئے ہیں اگر کوئی بڑا ہے تو اسے اس لئے بہتر سمجھے کہ یقیناً زیادتی عمر کے باعث اس کی نیکیاں

مجھ سے زیادہ ہیں اگر کوئی کمزور ہو تو اس لئے اسے خود سے بہتر سمجھے کہ یہ کمزور ہے کسی پر ظلم و زیادتی نہ کر سکا ہو گا کسی کی حق تلفی نہ کر سکا ہو گا اگر کوئی خود سے طاقت ور ہو تو اسے اس لئے اچھا سمجھا جائے کہ یقیناً اس نے مظلوموں کی مدد کی ہو گی اور میں طاقت نہ ہونے کے باعث اس نیکی سے محروم رہا ہوں گا اگر کوئی ہمعصر ہے تو اسے اس لئے اچھا سمجھا جائے کہ نیکیوں کے مواقع دونوں کو یکساں نصیب ہوئے یقیناً وہ مجھ سے نیکیوں میں سبقت لے گیا ہو گا اور میں غفلت اور سستی کے باعث ان نیکیوں سے محروم رہا زاویہ نظر کی یہ تبدیلی دراصل امتثال ہے اس حدیث نبوی کا کہ آپ نے دوسروں کے بارے میں گمان کرنے کے باب میں فرمایا:

ظنو المؤمنین خیرا — مومنین کے متعلق حسن ظن رکھو۔

گویا دوسروں کو اپنے سے بہتر جاننا اور اپنی ذات کے اندر موجود ہر قسم کے کبر و غرور اور خود پرستی کی نفی کر دینا تزکیہ نفس کا پہلا قدم ہے جو انسان ہر وقت حصار ذات میں مقید رہتا ہے اسے غرور و نخوت اور احساس کبر غفلت میں مبتلا رکھتا ہے۔ ہر وقت ذاتی توصیف و آفرین کے چکر میں رہتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ میں دوسروں کی نسبت زیادہ عالم ہوں باعمل ہوں' نیک ہوں' زیادہ خوبیوں اور صلاحیتوں کا مالک ہوں اس لئے دوسروں سے بہتر ہوں۔ تزکیہ نفس کی پہلی ضرب اس خیال خام پر پڑتی ہے اور خود پرستی کے اس بت کو پاش پاش کر دیتی ہے یہ ممکن نہیں کہ ایک آدمی حصار ذات میں مقید ہو' ہستی اور خود پرستی کا شیدا ہو اسے تصوف اور تزکیہ نفس کی گرد بھی نصیب ہو سکے۔ تزکیہ نفس تقاضا کرتا ہے کہ اگر تجھے تصوف اور حقیقت کی راہ پر چلنا ہے تو اپنی ذات کے حصار کو توڑ کر خود پرستی کے بت کو پاش پاش کر کے تجھے اپنے غرور و کبر سے نجات حاصل کرنا ہو گی ورنہ تم دین کے داعی بن کر جتنے بھی بت توڑو گے توحید کا علم بلند کرو گے شرک کو نیست و نابود کرنے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دو گے لیکن تمہارے من کا بت نہ ٹوٹ سکے گا اور جب حقیقت آشکار ہو گی تو تمہیں غالب کی زبان میں اعتراف کرنا پڑے گا۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

جو لوگ شریعت و طریقت کی راہ پر چلتے ہیں وہ اپنی راتیں عبادت و ریاضت میں گزارنے کے باوجود اس قدر منکسر ہوتے ہیں کہ شاید ہماری عبادت میں کوتاہی کے باعث یہ گناہ بن گئی ہو وہ بارگاہ ربوبیت میں عرض پرداز ہوتے ہیں کہ اے مولا! جس ڈھب سے تیری عبادت کرنا تھی اس ڈھب سے تو ہم آگاہ نہ تھے۔ شاید تجھے ہماری ریاضت کا یہ انداز پسند بھی آیا ہے یا نہیں! تو نے ہماری اس کاوش کو شرف قبولیت بخشا ہے یا نہیں! یہی وجہ ہے کہ وہ عبادت کر کے بھی خود کو گناہ گار تصور کرتے ہیں اور ادھر بدنصیبی و خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ محبت کی حلاوتوں سے بے بہرہ ہونے کے باوجود' اللہ سے جذباتی ربط کے فقدان کے باوجود خود کو اعلیٰ اور روح دین کے شناور گرداننے کا جنوں سوار ہے۔ یہی ہوا و ہوس' غفلت و کوتاہی' خود فریبی و خود پرستی اور غرور و کبریائی کے بت ہیں جو اولاً خواہشات ہوتی ہیں۔ ثانیاً ضروریات بن جاتی ہیں اور پھر ان کے "واقع" ہونے کا زعم ہو جاتا ہے انسان ہوا و ہوس کے بت اپنے اندر پالتا ہے اور ان کی پرورش کر کے انہیں اپنا معبود بنا لیتا ہے اور پھر شعوری و لاشعوری دونوں سطحوں پر اس کی جبین نیاز ہوائے نفس کے ان بتوں کے آگے جھکنے لگ جاتی ہے اس نفسانی کیفیت کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ فرمایا:

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ	کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی
(الفرقان' ۲۵:۴۳)	نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا۔

جو زبان سے تو یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کو اپنا رب مانتا ہوں لیکن در حقیقت وہ اللہ کو نہیں مانتا بلکہ اپنے ہوائے نفس کو عملاً اس نے خدا کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے من کی دنیا میں جھانک کر دیکھے' خدا کی ذات اسے بصیرت بخش دے' اسے اپنے احوال کی خبر ہو جائے تو یہ دلخراش حقیقت سامنے آ جائے گی کہ ہم میں سے کوئی خود کو خدا کے برابر اور کوئی خدا سے بھی بڑھ کر تصور کرتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے حضرت خواجہ سلیمان تونسوی ؒ کا ایک واقعہ مفید مطلب اور آنکھیں کھول

دینے کے لئے کافی ہے۔

واقعہ یوں ہوا کہ ایک عالم دین آپ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوئے اور عرض کی حضرت! مجھے درس فقر دیجئے! آپ نے فرمایا کہ ہم فقیروں کے پاس تو فقر کا ایک ہی سبق ہے اور وہ یہ کہ اگر اور کچھ بھی نہ ہو سکے تو اتنا ضرور کرو کہ خدا کو اپنے سے بہتر نہ سمجھ سکو تو کم از کم اپنے جیسا ہی سمجھ لیا کرو۔ وہ عالم دین چونکے اور کہا۔ استغفر اللہ آپ نے کیسی بات کہہ دی؟ یہ تو کفر ہے! ایک انسان کی کیا مجال کہ وہ خود کو اپنے خالق و مالک کے برابر تصور کرے۔ آپ نے فرمایا کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے فقیروں کے پاس تو یہی سبق ہے۔

پھر فرمایا مولانا! آپ رات مسافر خانہ میں قیام فرمائیں۔ انشاء اللہ صبح ملاقات ہو گی اور پھر گفتگو کریں گے۔ رات قیام کے دوران حضرت خواجہ تونسوی ؒ نے مولانا کو کھانا بھیجا جس میں دو روٹیاں تھیں ایک تازہ اور دوسری باسی۔ اسی طرح دو سالن بھیجے ایک تازہ تھا اور دوسرا سالن باسی تھا۔ عالم دین موصوف نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ ایک محتاج دروازہ پر آیا اور صدا لگائی کہ حضرت! مسافر ہوں اللہ کے نام پر کچھ مل جائے۔ انہوں نے باسی روٹی اور باسی سالن اٹھا کر اس محتاج کو دے دیا جبکہ تازہ روٹی اور تازہ سالن خود تناول فرمایا۔ صبح جب حضرت خواجہ تونسوی ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے وہی والی باسی روٹی اور باسی سالن مولانا کے سامنے رکھ دیا اور فرمایا مولانا! اگر خدا کو اپنے جیسا بھی تصور کیا ہوتا تو خدا کے لئے باسی روٹی اور باسی سالن نہ دیا ہوتا اور تازہ سالن اور تازہ روٹی کو بھی برابر برابر تقسیم کر لیا ہوتا۔ آدھا کھانا خود کھا لیتے اور آدھا خدا کے نام پر مانگنے والے کو دے دیتے۔ یہ انتہائے نادانی ہے کہ ایک طرف قولاً خدا کو خود جیسا ماننے سے انکار ہے اور ایسا کہنے کو کفر گردانتے ہیں اور دوسری طرف عملاً خدا کو خود سے بھی........ العیاذ باللہ! آپ نے فرمایا۔ اب بتاؤ! تم خود کو خدا کے برابر تصور کرتے ہو یا اس سے بھی بڑھ کر تصور کرتے ہو؟

تصوف کی تعلیم تو یہ ہے کہ خدا سے بڑائی یا برابری کا تصور تو درکنار خدا کے کسی بندے کو بھی اپنے سے کمتر نہ سمجھو۔ تزکیہ نفس اسی وقت عمل میں آتا ہے۔ جب

نفس انسانی ہر قسم کی برتری بالاتری کے تصور سے پاک ہو جائے اور ہوائے نفس کے جتنے بت پال رکھے ہیں ان کو پاش پاش کر دے۔ ہوائے نفس کے بتوں کے آگے جھکنے سے انکاری ہو جائے اور اپنی جبین نیاز صوری و معنوی ہر اعتبار سے صرف رب کائنات کے سامنے خم کرے۔

اگر نفس انسانی یہ کیفیت حاصل کر لے تو تصوف کا پہلا مقصد حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ تزکیۂ نفس نام ہے اس کیفیت کا جو بندے کو صحیح معنوں میں اللہ کا بندہ بنا دیتی ہے اور پھر انسان کی جبیں کسی غیر کی دہلیز پہ جھکنے کی بجائے صرف خالق حقیقی کی دہلیز پر جھکنے کا درس دیتی ہے اور وہ ذاتِ الٰہی سے محبت کے اس نقطہ کمال کو پالیتا ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے کہ۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (الانعام، ۶: ۸۰)

میں نے تو اپنا منہ اسی ذات کی طرف یکسو ہو کر کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

تعلیم تصوف کے اس پہلے مقصد کی تصدیق و توثیق قرآن حکیم ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ (الشمس، ۹۱: ۷-۱۰)

اور نفس کی (یعنی انسانی جان کی) قسم اور اس کی (قدرت و حکمت کی) جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کو اپنی بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (اختیار کرنے) کی سمجھ عطا کی یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا اور نامراد ہوا جس نے اس (روح) کو خاک میں ملا دیا۔

گویا تصوف کا تو پہلا ہی قدم انسان کو تعطل، جمود، غفلت اور تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھا کر اس کے قلب و باطن کو روشنی و حرارت عطا کر کے اسے وہ حر...، وہ انقلاب، وہ تازگی، وہ جوش و عمل اور قوت کردار عطا کرتا ہے کہ پھر تصوف کی راہ کا سالک، محبت الٰہی سے سرشار ہو کر اپنے فکر و عمل کی ضیا باریوں سے دنیا کو روشن روشن کر دیتا ہے اس کی ذات وہ سیل بے پناہ بن جاتی ہے کہ

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

پھر وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے نہ جھکتا ہے، نہ لرزتا، نہ بکتا ہے اور نہ گھبراتا ہے۔ گویا فلسفۂ تصوف مرد مومن کو وہ راہ دکھاتا ہے کہ اس کی شخصیت ایک چٹان بن جاتی ہے اور ہر قسم کی آلائشوں کے طوفان، مخالفتوں کے جھکڑ اور خواہشات کی آندھیاں اس سے سر پٹخ پٹخ کے دم توڑ دیتی ہیں لیکن اس کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش پیدا نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ اس محبوب کی یاد میں مگن ہوتا ہے جس کے عشق و محبت کے نشہ کو کوئی ترشی آمادہ زوال نہیں کر سکتی اور اللہ کا یہ دیوانہ و مستانہ بزبان حال اڈنے والے تمام طوفانوں اور آفتوں کو مسکرا کر جواب دیتا ہے کہ

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے!
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

۲۔ صفائے قلب

تزکیۂ نفس کی بحث میں ہم نے تزکیۂ نفس کا نقطۂ آغاز او نقطۂ کمال واضح کیا۔ مقصد یہ تھا کہ تعلیمات تصوف کو عملاً اپنا کر مرد مومن کی شخصیت حسن و جمال اور قوت و جبروت کے جس سانچے میں ڈھلتی ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک آغاز ہی میں دکھا دی جائے تاکہ اس کے حسن نظارہ سوز کے مکمل نظارے کے لئے دل و دماغ مشتاق بھی ہوں اور تیار بھی۔ تزکیۂ نفس کے بعد تصوف کا دوسرا بنیادی مقصد صفائے قلب ہے۔ جب نفس انسانی گناہ کی آلائشوں، آلودگیوں اور رذائل اخلاق سے پاک ہو جاتا ہے تو اس

طہارت کے اثرات انسان کے قلب و باطن پر مترتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب انسان کی قوت غضبیہ اس کے لطیف جذبۂ رحم اور عفو و درگزر سے مغلوب ہو جاتی ہے تو شخصیت میں جمالیاتی پہلو غالب آ جاتا ہے اور عملی زندگی میں اس کے اثرات محسوس و مشہود ہوتے ہیں۔ انسان کے اندر سے لالچ اور حرص کے گھٹیا داعیات و جذبات کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو انسان میں ماسوااللہ سے بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے جو محبت الٰہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں یہ بے نیازی بڑھتی چلی جاتی ہے در محبوب سے نیاز مندی میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے اور دل کی دنیا بدلتی جاتی ہے جب غرور و تکبر کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو دماغ سے انا ولا غیری کا خناس نکل جاتا ہے پھر انسان کے دل میں نرمی، رقت اور رافت پیدا ہوتی ہے جو تجلیہ و تصفیہ قلب کا سامان بنتی ہے جب تصوف کا یہ دوسرا مقصد تکمیل پذیر ہوتا ہے تو دین کا ایک اہم تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ تجلیۂ قلب قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم ہے کیونکہ کار جہاں اس قدر دراز ہے کہ

قدم انسان کا راہ دھر میں تھرا ہی جاتا ہے
کوئی بچ کے چلے کتنا یہ ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

جو لوگ اپنے کیے پر نادم ہوتے ہیں، روتے ہیں اور اللہ سے معافی کے طلبگار ہوتے ہیں انہیں معاف کر دیا جاتا ہے ان کے دل پر لگ جانے والی آلودگی دھو دی جاتی ہے اور جو اپنے گناہ پر اصرار کرتے رہ جائیں ان کے دلوں کا زنگ اور سیاہی گہری اور مستقل ہوتی چلی جاتی ہے اس کیفیت کا نقشہ قرآن حکیم نے یوں کھینچا ہے۔

كَلَّا بَلْ، رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (المطففین، ۸۳: ۱۴)

کوئی نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کی کمائیوں نے زنگ چڑھا دیا ہے۔

اس زنگ اور سیاہی کا سبب انسان کے وہ افعال ہوتے ہیں جو اس کی فطرت سے متصادم و متخالف ہوتے ہیں چونکہ اسلام دین فطرت ہے لہٰذا اسلام سے بھی متصادم ہوتے ہیں اولاً، انسان کی شخصیت اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے، گناہ کا اثر اس کے قلب و باطن کو بے قرار و مضطرب کر دیتا ہے لیکن جب ان افعال میں اصرار پیدا ہوتا

ہے تو یہ زنگ دل پر اس قدر چھا جاتا ہے کہ ضمیر' مردہ ہو جاتا ہے کوئی بھی بری بات بری بات نہیں لگتی نتیجۃً دل طہارت کے نور سے خالی اور محبت الٰہی کی روشنی سے محروم ہو جاتا ہے' نبی اکرم ﷺ نے ان افعال کے اثرات کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان فرمایا:

عن ابی هريره عن رسول الله ﷺ قال ان العبد اذا اخطا خطيئه نكتت فى قلبه سوداء فاذا هو نزع واستغفر و تاب صقل قلبه وان عاد زيد فيها حتى تعلو قلبه و هو الران الذى ذكر الله كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون

(جامع الترمذی' ۲:۱۷۱)(ابن ماجہ :۲۲۳)

حضرت ابوہریرہؓ حضور ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا بے شک بندہ جب غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے پس اگر وہ اس سے باز آجائے اور توبہ واستغفار کرلے تو اس کے دل کو صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ اس غلطی کا دوبارہ ارتکاب کرے تو اس سیاہی میں اضافہ کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ سیاہی اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے اور یہی وہ "الران" ہے جس کو قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے ذکر فرمایا۔ خبردار بلکہ یہ ان کے اعمال ہیں جو ان کے دلوں پر غالب آگئے۔

گویا تصوف کا ایک مقصد' دل' کو اس کی حقیقی کیفیت میں لے آنا ہے۔ اگر دل زنگ آلود رہا تو "فاجر" ہے اور اگر پاک ہو گیا تو متقی ہے اور پھر ہدایت قرآنی بھی اسی دل پر اثر انداز ہوتی ہے جو اثر پذیر ہو جس طرح صاف' تازہ اور شیریں دودھ کو کوئی بھی صاحب دانش غلیظ' زنگ آلود اور بدبودار برتن میں نہیں ڈالتا اسی طرح اللہ سبحانہ' جو حکمت و دانش کا منبع و سرچشمہ ہیں۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہدایت قرآنی کے نور کو

زنگ آلود دلوں میں ڈال دیں کیونکہ غلیظ برتن تو خوشبودار دودھ کو بھی متعفن کردے گا جس طرح بارش گندی زمین پر ہوتی ہے تو بجائے سبزہ کے بدبو اور تعفن اٹھتا ہے۔

بارش ایک ہی ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے' بارش کے قطروں میں کوئی امتیاز نہیں لیکن اثر مختلف ہوتا ہے اگر زمین پاک صاف کردی گئی ہو' اس میں صحت مند بیج بو دیا جائے اور پھر مسلسل رکھوالی کی جائے تو بارش اس زمین سے سبزہ اگاتی ہے اور اسے تروتازگی ملتی ہے لیکن اگر زمین کو صاف کر کے گندگی کو ختم نہ کیا گیا ہو تو جب بارش کے قطرے گرتے ہیں وہاں سے تعفن پھوٹتا ہے بیماری جنم لیتی ہے اور زمین قابل نفرت ہو جاتی ہے اگر دل کبر و نخوت' حرص و لالچ' خود پرستی حب جاہ و منصب اور جذبہ بغض و عداوت سے متعفن رہے تو وہاں قرآنی تعلیمات کی بارش سے بھی تعفن پیدا ہو جاتا ہے اس حقیقت کو ایک تمثیل کے ذریعے قرآن حکیم نے خوب بیان فرمایا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○

(الاعراف' ۷: ۱۷۵-۱۷۶)

اے محبوب! ان کے سامنے اس کا حال بیان فرمایئے جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان سے (اپنے قلبی زنگ کے باعث) بھاگ نکلا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ بھٹکنے والوں میں سے ہو کر رہا اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے اسے عظمتیں عطا کرتے لیکن (اس کے ضمیر نے اسے نہ جھنجھوڑا) وہ تو زمین (پستی) سے چمٹا چلا گیا اس کی مثال کتے جیسی ہے اب تم اس پر حملہ کرو تب بھی (اس کی ہوا و ہوس) کی زبان لٹکی رہے گی اور اگر چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رکھے گا۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے

ہیں آپ ان سے یہ قصے بیان فرماتے
جائیں شاید کبھی یہ سوچنے پر مجبور ہو
جائیں۔

اگر دل کی دنیا ویران ہو تو آیات کا علم بھی انسان کو کچھ فائدہ نہیں دے پاتا اس کی ہوا و ہوس اسے دنیا کے حقیر فائدوں کی خاطر آیتیں بیچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ قرآن کا جو علم اس کو عظمتیں اور رفعتیں بخش سکتا تھا وہ اس کے لئے ذلت و رسوائی کا سبب بن جاتا ہے اور وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل ہوا و ہوس کی سیاہی سے اور کبر و نخوت کے زنگ سے آلودہ ہوتا ہے لیکن اگر انسان کا تزکیۂ نفس ہو چکا ہو' تصوف کا پہلا قدم اٹھا لیا گیا ہو۔ دل میں تصوف کا بیج بو دیا گیا ہو۔ دل متقی ہو چکا ہو تو قرآن اسے ہدایت و استقامت عطا کرتا ہے کیونکہ قرآن هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرہ' ۲:۲) ہے۔

بد نصیب قرآن سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور خوش بخت ہدایت پا جاتے ہیں اور یہ فیصلہ قرآن ہی کا ہے کہ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا (البقرہ' ۲:۲۶)

قرآن اور قرآنی تمثیلات ایک ہی ہیں لیکن کچھ بد نصیبوں کے حصے میں صرف گمراہی آتی ہے۔ ان کے استدلال کی بنیاد بھی قرآن ہی ہوتا ہے۔ لیکن دلوں کی کجی ہر بات کو کج کر دیتی ہے ان کا اپنا استدلال انہیں گمراہی کی طرف لے جاتا ہے لیکن اگر دل تقویٰ کے نور سے مستنیر ہو چکا ہو تو قرآن کا یہی استدلال آدمی کو ہدایت کی طرف لے جاتا ہے۔ جب دل ہر قسم کی آلودگی سے مجلیٰ و مصفیٰ ہو جائے اسی وقت وہ قرآن کی نظر میں قلب کا درجہ پاتا ہے اس کے بارے میں قرآن ہی کا فیصلہ ہے کہ

إِنَّ فِي ذَالِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ (قٓ' ۵۰:۳۷)

بے شک اس (بیان) میں درس عبرت ہے اس کے لئے جس کے پاس قلب سلیم ہو۔

یہی سبب ہے کہ علامہ اقبالؒ نے دل کو "دل" بنا دینے میں ہی امتوں کے تمام امراض کا علاج دیکھا ہے۔

دل مردہ دل نہیں ہے' اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

خوں تو ہر ذی روح میں ہوتا ہے جس طرح دل طبی لحاظ سے تو ہر وجود ذی روح میں رکھا گیا ہے لیکن خون کا آنکھ سے ٹپکنا اور دل کا "دل زندہ" ہونا سوائے طہارت' سوز و ساز اور درد و آرزومندی کے ممکن نہیں

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اگر دل محض گوشت کے ٹکڑے کا نام ہے تو وہ ہر ایک کے پہلو میں دھڑکتا ہے لیکن قرآن اس گوشت کے ٹکڑے کو دل نہیں مانتا وہ تو اس قلب سلیم کا مطالبہ کرتا ہے جو حالت موت سے نکل کر زندگی اور تازگی پا چکا ہو اور اللہ صرف ہماری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ دلوں کی حالت اور کیفیت پر نظر رکھتا ہے۔

صفائے قلب قرآن و سنت کی بنیادی تعلیم ہے اور تصوف کا دوسرا مقصد اس تعلیم کا امتثال کئے بغیر ممکن نہیں کہ پورا ہو جائے۔ قرآن کے یہ تقاضے تعطل اور جمود کیسے ہو سکتے ہیں؟ رہبانیت اور ترک دنیا کیسے ہو سکتا ہے؟ جب قرآن مقاصد تصوف کی تعلیم دیتے ہوئے قلب سلیم کا تقاضا کرتا ہے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ○ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ
(الشعراء' ۲۶: ۸۹۔ ۸۸)

جس دن انسان کے نہ مال کام آئے گا نہ اولاد۔ مگر جو اللہ کے پاس پاک دل لے کر آئے گا۔

صرف قلب سلیم ہے جو قیامت کے دن کام آنے والا ہے کیونکہ قلب سلیم کو کوئی رنج اور خوف نہ ہو گا۔ قلب سلیم کو مقام سلامتی اسی وقت ملتا ہے جب وہ تمام رذائل سے مجلّٰی و مصفّٰی ہو کر سلامتی میں آ جاتا ہے قلب سلیم قرآن کا تقاضا ہے اور راہ تصوف کی دوسری منزل۔ اس حقیقت کے ثابت ہو جانے کے بعد فلسفۂ تصوف کو روح دین سے الگ قرار دینا صرف فہم سقیم آفت ہی ہو سکتی ہے کوئی سلیم العقل اور سلیم

والقلب انسان تصوف کو اسلام سے الگ قرار دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قلب کے مرکز و آماجگاہ ہونے کے باب میں سورہ النور میں ایک بڑی جامع آیت ہے جو معانی کا خزینہ ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ○

(النور' ۲۴:۳۵)

اللہ ہی آسمان زمین کا نور ہے اس کا نور ایک ایسے طاق جیسا ہے جس میں ایک چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس میں ہے وہ فانوس گویا صاف شفاف موتی کی طرح چمکتا ہوا ایک ستارہ ہے (اور) چراغ شجر مبارکہ زیتون (کے تیل) سے روشن رہتا ہے جو شجر (زیتون) نہ مشرق کے رخ واقع ہے اور نہ مغرب کے رخ اس کا تیل (اس قدر لطیف و صاف ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ) اگر آگ اسے نہ بھی چھوئے تو بھی (خود بخود) بھڑک اٹھے گا (پھر ان منور فضاؤں میں عجب) نور پر نور (کا عالم ہے) اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کو (سمجھانے) کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا (پورا پورا) علم ہے۔

امام خازن' ابن کثیر اور علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ یہاں اللہ نے اپنے نور کی مثال مومن کے قلب سے دی ہے اگر تمثیل پر غور کیا جائے تو حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال قندیل کی سی ہے اگر انسان اس تمثیل کے حوالے سے اپنی ساخت پر غور کرے تو اس تشبیہ کی وجہ شبہ واضح

ہو جاتی ہے کہ انسانی سینہ چاروں طرف سے پسلیوں کے اندر گھرا ہوا ہے اوپر کی پسلیاں چھوٹی ہوتی ہیں جبکہ جوں جوں نیچے جاتے ہیں پسلیاں بڑی ہوتی چلی جاتی ہیں یہ سارا نقشہ قندیل کا ہے۔ دل اس سینے کے اندر محض گوشت کا ٹکڑا نہیں بلکہ وہ اس قندیل کے اندر چمکتا ہوا چراغ ہے۔

المصباح فی زجاجة سینہ مشکوٰۃ ہے اور اس میں روشن چراغ مومن کا دل ہے دل کے اوپر جو جھلیاں اور غلاف ہوتے ہیں یہ ایسے دبیز اور موٹے پردے نہیں کہ دل کا نور ان کے اندر دب کر رہ جائے۔

ان پردوں کی حیثیت شفاف شیشوں کی ہے۔ جب دل کا چراغ جلتا ہے تو بشریت اور جسمیت کے دبیز پردوں کے باوجود یہ جھلیاں شیشے کا کام کرتی ہیں۔ چراغ کی کرنیں ان کی چمک دمک کے واسطے سے زیادہ فیض رساں اور روشن تر ہو کر نکلتی ہیں۔ قلب مومن ہی وہ مقدس مقام ہے جہاں ذات باری اپنے انوار و تجلیات کا فیضان فرماتی ہے۔

اس کی تائید حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ رب العزت نے حضور نبی اکرم ﷺ کی زبان انور سے اعلان کروایا۔

لا یسعنی ارضی و لا سمائی و لکن یسعنی قلب عبدی المومن
(التفسیر المظہری ۹: ۷۵)

میں زمین و آسمان کی وسعتوں میں نہیں سما سکتا لیکن اپنے بندہ مومن کے دل میں سما جاتا ہوں۔

اور اللہ سبحانہ کے انوار کا جلوہ اسی وقت دل میں ارتکاز کرتا ہے جب دل ہر قسم کے زنگ اور آلودگی سے مصفیٰ ہو جائے اور جلائے قلب وہ اعزاز ہے جس کا انعام جلوۂ الٰہی کے انوار کا دل میں نور افشاں ہو جانا ہے۔ یہ تصوف کا دوسرا مرحلہ ہے دل کی اہمیت آیات و احادیث میں مختلف زاویوں سے واضح کی گئی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد

بے شک جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح ہو جاتا اور

الجسد کلہ الا و ھی القلب (صحیح البخاری '۱:۱۳) — اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا وجود خراب ہو جاتا ہے۔ خبردار آگاہ رہو وہ دل ہے۔

گویا دل کی کیفیات انسان کے فکر و عمل اور کردار کی بنیاد ہے اگر یہ مختلف رذائل اخلاق اور شرف انسانی کے منافی صفات سے آلودہ رہا تو یہ بگاڑ پوری شخصیت میں نمایاں ہو جائے گا اور یہ بنیاد درست ہو جائے تو اللہ کے دربار میں پسندیدہ شخصیت معرض وجود میں آتی ہے۔ الغرض دل وہ بنیاد ہے جس کی کجی پوری زندگی کو ٹیڑھا کر کے رکھ دیتی ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یہی سبب ہے کہ ہادی دو عالم ﷺ نے فرمایا:

کفی بالرجل شرا ان یری الناس انہ یخشی اللّٰہ تعالیٰ وقلبہ فاجر (الروض الحسیب ۸۷) — کسی آدمی کے لئے اتنی برائی ہی کافی ہے کہ وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرے کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کا دل فاجر (نافرمانی کرنے والا) ہو۔

تصوف کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن یکساں ہو جائے اس تجلیۂ قلب سے پھوٹنے والے انوار اس کی شخصیت کو منور کر دیں اور کسی کو یہ طعنہ دینے کا موقع نہ مل سکے کہ

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

تصفیہ قلب کے حصول کے لئے تعلیم نبوی میں عملی ذرائع بھی بیان کئے گئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لکل شی صقالۃ و صقالۃ القلوب ذکر اللّٰہ (مشکوٰۃ المصابیح:۱۹۱) — ہر ایک چیز کے لئے صیقل ہوتی ہے اور دلوں کا صیقل (پالش) اللہ رب العزت کا ذکر ہے۔

اور جب دل صیقل ہو جاتا ہے تو امراض سے پاک ہو جاتا ہے۔ مصفی و مجلی ہو جاتا ہے اس سے وہ زنگ اتر جاتا ہے جس کا ذکر نبی اکرم ﷺ نے یوں فرمایا کہ

ان هذه القلوب تصدء كما يصدء الحديد فاجلوها بذكر الله
(تذکرۃ القادریہ: ۲۶۷)

بے شک دل زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے لہٰذا تم اس کے زنگ کو اللہ کے ذکر سے دور کرو۔

گویا جس طرح لوہے سے زنگ دور کرنے کے لئے اسے رگڑا جاتا ہے تا آنکہ وہ مصفی ہو کر چمکنے لگتا ہے اسی طرح ذکر الٰہی تزکیہ و تصفیہ قلب کا سبب ہے۔ قرآن حکیم متعدد مقامات پر صفائے قلب کی تعلیم دیتا ہے اور یہی امر راہ تصوف کا دوسرا مرحلہ ہے۔

۳۔ اطاعت حق

راہ تصوف کا تیسرا ارتقائی مرحلہ اطاعت حق کا تحقق ہے جس کے بارے میں اصولی حکم قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر وارد ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (النساء، ۴: ۵۹)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ رب العزت کی اور اطاعت کرو رسول اللہ (ﷺ) کی۔

گویا اطاعت الٰہی ایمان کا تقاضا ہے۔ ایمان عقیدہ ہے تو اطاعت اس کے تقاضے پورے کرنے کی تصدیق و توثیق۔

اطاعت حق کے متحقق ہونے کے لئے الٰہی اصول اطاعت رسول ہے اور ہر بات طے کر دی گئی کہ

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ
(النساء، ۴: ۸۰)

جس نے رسول اللہ (ﷺ) کی اطاعت کی اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔

اور رسول ﷺ کی یہ اطاعت عین اطاعت الٰہی اس لئے ہے کہ یہ اللہ ہی کے حکم سے ہوتی ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۴: ۶۴)	اور ہم نے تو ہر رسول کو اس لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اطاعت الٰہی ایمان کا بنیادی تقاضا ہے اور تصوف کا مقصود اس اطاعت کو درجہ کمال تک پہنچانا ہے اور جب یہ درجہ کمال کو پہنچ جائے تو تصوف کا تیسرا مقصد تکمیل آشنا ہوتا ہے۔

اطاعت حق کے کمال تک پہنچنے کی کیفیت یہ ہے کہ زندگی احکام الٰہی کی اس قدر پابند ہو جائے کہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کا تصور بھی کبھی حاشیہ خیال میں نہ آسکے۔ جذبہ اطاعت رگ و ریشہ میں یوں سما جائے کہ اضطراری یا اختیاری کسی بھی حالت میں اس کا قدم جادہ اطاعت سے پھسلنے نہ پائے۔ عام آدمی سعی و کاوش سے خود کو احکام الٰہی کا پابند بناتا ہے جبکہ جادہ تصوف و طریقت کے راہرو میں یہ اطاعت یوں رچ بس جاتی ہے کہ وہ کوشش کر کے بھی اطاعت کے دائرے سے باہر کسی قول یا فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اسے وہ نسبت و تعلق میسر آتا ہے کہ اس کا کوئی قدم بلا ارادہ بھی جادۂ اطاعت سے نہیں ہٹ سکتا جب کسی معاملے میں ابہام کی کیفیت ہوتی ہے، اور اللہ اور اس کے حبیب ﷺ کی منشاء کا علم نہیں ہوتا اہل تصوف اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔

"حضرت بایزید بسطامی" کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے پوری زندگی خربوزہ کاٹ کر نہ کھایا۔ کسی نے وجہ دریافت کی تو فرمایا میں کوشش کے باوجود آج تک معلوم نہ کر سکا کہ میرے آقا ﷺ نے خربوزہ کس طرح کاٹ کر کھایا اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں الٹی سمت سے کاٹ کر نہ کھالوں۔"

گویا اطاعت حق زندگی پر اس طرح غالب اور حاوی ہو جاتی ہے کہ اس کے

خلاف قدم اٹھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اہل تصوف کی اطاعت کی یہی کیفیت راسخ ہوتی ہے۔

حضرت بایزید بسطامی" کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص دور سے آپ کی خدمت میں بیعت کرنے کے لئے آیا۔ ایک دوماہ آپ کے پاس رہنے کے بعد بیعت کئے بغیر واپس جانے کے لئے تیار ہوا تو آپ نے دریافت کیا کہ کس غرض سے آئے تھے؟ واپس کیوں جا رہے ہو؟ اس نے عرض کیا:

"حضرت بیعت کی غرض سے آیا تھا اب واپس جا رہا ہوں کیونکہ میں نے اتنی مدت آپ کے پاس رہنے کے باوجود آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ حضرت بایزید نے دریافت فرمایا۔ کیا تم نے اتنی مدت میں میری زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا اور رسول ﷺ کی نافرمانی میں گزرتے دیکھا' اس نے جواباً عرض کیا "نہیں" آپ نے فرمایا۔ ہمارے پاس اس سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں۔

یہی سبب ہے کہ صوفیاء کے ہاں یہ قول مشہور ہے کہ

الاستقامۃ فوق الکرامۃ دین میں استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے۔ جو بات عوام میں کرامت کے طور پر مشہور ہے صوفیاء اسے اپنے پاؤں کی گرد بھی نہیں سمجھتے۔ ہواؤں میں اڑنا' آگ میں جانا' پانی پہ چلنا عوام کے ہاں کرامت ہے۔ دلیل بزرگی ہے لیکن اہل دل کے ہاں یہ کرامت نہیں اہل دل کی پوری زندگی اگر اطاعت واستقامت میں بسر ہو جائے تو ان کے نزدیک یہی سب سے بڑی کرامت ہے گویا تصوف کرامتوں کا نام نہیں ہے۔ جیساکہ عوام کا خیال ہے بلکہ تصوف استقامتوں کا نام ہے۔ میری نظروں سے آج تک کسی صاحب حال کا قول نہیں گزرا کہ اس نے کسی سے کرامت طلب کی ہو بلکہ معیار تصوف پر کسی کو جانچنے کے لئے استقامت طلب کی جاتی ہے جب ایک مرد حق عشق الٰہی کی راہ میں نکلتا ہے تو کرامتیں اس کے پاؤں سے اٹھنے والی گرد کے ذروں کی طرح ہوتی ہیں لیکن اس کی نظر کرامتوں پر نہیں بلکہ استقامتوں پر ہوتی ہے اگر وہ مردہ دلوں پر نظر کرتا ہے تو مردہ دلوں کو زندگی ملتی ہے اور اس کی شان

یہ ہوتی ہے کہ

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

وہ مردہ دلوں کو اذن الہٰی سے زندہ ہو جانے کا حکم دیتا ہے تو وہ زندہ ہو کر قبروں سے نکل آتے ہیں۔ وہ درختوں پر نظر کرتا ہے تو وہ بولتے ہیں وہ بعد پر نظر کرتا ہے تو وہ قرب میں بدل جاتا ہے' بیماروں پر نظر کرتا ہے تو وہ شفایاب ہو جاتے ہیں وہ سر جھکا کر اپنے انوار الہٰی سے معمور سینہ پر نظر کرتا ہے تو عالم غیب کی حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں ان سب امور کو عوام کمال تصور کرتے ہیں۔ جبکہ اہل دل کے ہاں ان امور کو کمال تصور نہیں کیا جاتا۔

وہ ان امور کو اپنے احوال و مقامات کے ضمنی اثرات خیال کرتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جس طرح مریض طبیب کے پاس آئے اور کہے کہ مجھے اکثر و بیشتر بھوک نہیں لگتی۔ طبیب اس کے بنیادی مرض کا علاج کرتا ہے تاکہ اصل بیماری سے صحت یابی اور شفا نصیب ہو جائے علاج کے نتیجے میں بھوک بھی لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ طبیب کے علاج کا منتہائے مقصود بھوک کو معمول پر لانا نہیں بلکہ مرض کے جراثیم کو ختم کر کے مریض کو بیماری سے نجات دلانا ہے اور بھوک کا معمول پر آ جانا اس علاج کا ایک ضمنی نتیجہ ہے۔ اہل دل ہمیشہ اطاعت میں استقامت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے وہ استقامت میں پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کرامتیں ان کے قدموں پر نچھاور ہوتی ہیں۔ اگر محض ہواؤں میں اڑنا اہل دل کا کمال ہو تو یہ کمال تو پرندوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگر آگ میں جانا کمال مانا جائے تو یہ کمال بڑے بڑے جادوگروں کو بھی حاصل ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ کرامات و کمالات ہی تصوف نہیں بلکہ یہ جادہ حق کے پاؤں سے اڑنے والی گرد کے ذرات ہوتے ہیں۔ ان کی زبان سے نکلنے والی ہر بات پوری ہوتی چلی جاتی ہے اور خوارق عادت واقعات و کرامات ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ جان لیجئے کہ اگر کوئی شخص شیخ طریقت' رہبر شریعت

اور پیر کامل ہونے کا ادعا رکھتا ہے درآں حالیکہ کہ وہ حق کے راستے پر گامزن نہیں ہوتا' شریعت و طریقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور شریعت سے انحراف و خلاف ورزی کو طریقت کا تقاضا جانتا ہے یا طریقت کا حصہ سمجھتا ہے ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت کرنا حرام ہے۔ شیخ کامل کے پرکھنے کا اولین اصول یہ ہے کہ وہ شریعت و طریقت کی تعلیم پر پوری طرح کاربند ہو اگر اسے اطاعت رسول ﷺ میں استقامت نصیب ہے تو پیر طریقت کہلانے کا حقدار ہے۔ اس سے نسبت بیعت استوار کرنا درست ہے اور اگر وہ خود استقامت سے محروم ہے تو مریدوں کو کیا استقامت سکھائے گا۔ یہ تصور کرنا کہ ولایت و طریقت اہل دل کا راستہ ہے اور شریعت و سنت کی تبلیغ اور عمل مولویوں کا راستہ ہے' سراسر گمراہی اور ضلالت ہے۔

سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک دفعہ شیطان بجلی کی طرح چمکا اور آواز دی اے عبد القادر! تو نے میری اتنی عبادت کی ہے کہ اب مزید اطاعت و عبادت کی ضرورت نہیں رہی تو تمام مراحل و منازل طے کر چکا ہے۔ آپ نے **لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم** پڑھا اور فرمایا کہ اگر نبی اکرم ﷺ سے جو کہ شریعت عطا کرنے والے ہیں۔ شریعت کی پابندی والتزام ساقط نہیں ہوا تو آپ کے کسی امتی سے کیسے ساقط ہو سکتا ہے؟ شریعت کی پابندی کا ساقط ہو جانا ولایت کا کوئی درجہ نہیں۔ یہ راہ شیطنت و گمراہی اور ضلالت کی راہ ہے۔ شیطان پھر انسانی صورت میں آیا اور کہنے لگا۔

حضرت! میں نے بہت بڑا وار کیا تھا لیکن آپ کا علم آپ کو بچا گیا۔ آپ نے پھر لاحول ولا قوۃ پڑھا اور فرمایا ظالم! میں علم کی قوت سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل و کرم سے بچا ہوں اہل دل اور اہل صفا کا یہ عالم ہے کہ اگر ان سے کمال صادر ہو جائے تو اسے اپنا کمال تصور نہیں کرتے بلکہ اللہ کا احسان مانتے ہیں اس سلسلے میں تخت بلقیس کا واقعہ شاہد ہے۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا فرمایا اے سردارو! تم میں کون ہے جو

قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ○ قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ وَاِنِّیْ عَلَیْہِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ ○

اس کا تخت میرے سامنے لے آئے قبل اس کے کہ وہ فرمانبردار ہو کر میرے سامنے حاضر ہوں۔ جنوں میں سے ایک طاقتور (تیز طرار) جن نے کہا میں اسے حاضر کئے دیتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں اور میں اس (کام) کے لئے طاقتور اور امانت دار ہوں۔

جنوں کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں سے ایک صاحب نے کہا:

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ○

(النمل ۲۷:۳۸-۴۰)

(حضرت سلیمان کے درباریوں میں سے) ایک شخص نے جس کے پاس علم کتاب تھا اس نے کہا۔ میں آپ کو آنکھ جھپکنے سے قبل ہی اسے حاضر کر سکتا ہوں۔ پھر جب (سلیمان علیہ السلام نے) اس (تخت) کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو فرمایا۔ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اور جو ناشکری کرتا ہے تو (خود اپنا نقصان کرتا ہے) میرا پروردگار بے نیاز کرم فرمانے والا ہے۔

آصف بن برخیا نو سو میل دور سے تخت بلقیس کو پلک جھپکنے سے پہلے لے آتے ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے مرید کے اس کمال کو اپنی ذات یا اس کی طرف منسوب کرنے کی بجائے فرماتے ہیں یہ میرے رب کا فضل ہے میرے رب کا کمال ہے اس آیت کریمہ سے اولاً یہ مترشح ہوتا ہے کہ خارق عادت واقعات اولیاء اللہ

کے لئے اللہ کے فضل سے چنداں مشکل نہیں بلکہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

غالب وکار آفریں کارو کشا، کار ساز

ثانیاً یہ آزمائش کے لئے ہوتا ہے کہ وہ استقامت کا ترجیح دیتے ہیں یا کرامت کو ثالثاً وہ اس کا شکر واجب خیال کرتے ہیں اور شکر یہی ہے کہ اس کمال کو ذات باری تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے اور اپنی طرف ان کمالات کے انتساب کو کفر گردانتے ہیں۔

رابعاً جو کمال کا انتساب اپنی طرف کرتے ہیں۔ جیسے جن نے کہا کہ میں اس تخت کو آپ کے یہاں سے اٹھنے سے قبل لاسکتا ہوں اور پھر اس نے اس پر

اِنِّیْ عَلَیْہِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ (النمل، ۲۷:۳۹) بے شک میں اس کام کے لئے طاقتور امانت دار ہوں۔

کے الفاظ کا اضافہ بھی کیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے محسوس فرمایا کہ یہ کمال کی نسبت اپنی طرف کر رہا ہے اور آپ نے اس سے یہ خدمت نہ لی۔ کمال کو اپنی طرف منسوب کرنے والے بارگاہ نبوت میں شرف قبولیت نہیں پاتے۔ اللہ کے محبوب بندوں کا کمال اپنے ذاتی کمال کی نفی اور عاجزی میں ہے جب کوئی مرد حق اللہ کے ہاں اپنے اخلاص و محبت کے باعث انتہائی قربتوں کا اعزاز پاتا ہے تو اسے مقام "تکوین" عطا ہو جاتا ہے۔ وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے لیکن "احیاء" کی حقیقی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے نہ کہ خود اس کی طرف۔ وہ **قم باذنی** کہہ کر نہیں بلکہ **قم باذن اللہ** کہہ کر مردوں کو زندہ کرتا ہے وہ کسی کمال کو اپنی ذات کی طرف منسوب نہیں کرتا کیونکہ خود کی طرف منسوب کرنا چھوٹا کمال ہے جبکہ ذات باری کی طرف کسی کمال کو منسوب کرنا در آں حالیکہ اس کا صدور اس کے اپنے ہاتھوں سے ہو رہا ہو۔ یہ بڑا کمال ہے گویا جب مرد مومن اطاعت حق کے اس درجے پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا عمل سر مو احکام الٰہی سے انحراف نہیں کرتا اور اس انحراف کا کوئی تصور بھی اس کے ہاں باقی نہیں رہ جاتا تو وہ مرد مومن تصوف کے تیسرے مقصد "اطاعت حق" کا اپنی ذات کے اندر تحقق حاصل کر لیتا ہے۔

مرحلہ ثانیہ

تعلیمات و مقاصد تصوف کا مرحلہ اولی مکمل ہوا اب ہم مرحلہ ثانیہ کا آغاز کرتے ہیں۔

ا۔ محبت الٰہی

اسلام نے انسانوں کی ہدایت اور اس ہدایت پر عمل پیرا ہو کر خلیفہ کا مقام پانے کا جو ضابطہ عنایت کیا ہے وہ قرآن حکیم ہے۔ قرآن کی تعلیمات پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ تعلیمات اسلامی کی روح عشق و محبت ہے۔ مضمون عشق قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ‘۲:۱۶۵)	ایمان والے اللہ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔

یعنی جو لوگ اہل ایمان ہیں اور ایمان کی حقیقی حلاوت ولذت سے بہرہ یاب ہیں وہ اللہ کی ذات سے ٹوٹ ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اللہ سے عشق کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں اللہ کی محبت اجالے کر دیتی ہے۔ ان کی نس نس میں عشق الٰہی سرایت کر جاتا ہے پھر انہیں خواہ آتش نمرود میں ڈالو یا کوئلوں پر جھلسا دو‘ تپتی ریت پر تڑپاؤ یا اذیتیں دے دے کر بے ہوش کر دو عالم بے خودی میں بھی ان کے لبوں سے احد احد کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

حب رسول ﷺ ہی حب الٰہی ہے

پھر اس کی محبت کے سوا کسی غیر کو ان کے دل میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہوتی ان کا دل محبت رسول ﷺ سے لبریز ہوتا ہے کیونکہ محبت رسول ﷺ ہی دراصل

محبت الٰہی ہے۔ رسول ﷺ کی محبت اللہ ہی کی محبت کا پرتو ہے۔ اس لئے یہ اللہ کی محبت سے جدا کوئی محبت نہیں۔ اہل حق کے دل میں کسی غیر کی محبت کا پیدا ہونا ناقابل تصور ہے۔ اہل دل صوفیا نے مقام ولایت و قربت الٰہی کو اللہ کی محبت کے تصور سے ہی پایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک جادہ عشق الٰہی کے رہرو بننے سے پہلے ایک عورت کی محبت میں گرفتار تھے' رات کے وقت اس عورت کے پاس جاتے اور ساری رات چھپ کر اس کا منہ تکتے رہتے۔ ایک رات اسی طرح تکتے رہے تا آنکہ فجر کی اذان ہو گئی اور وہ اس عورت کے جمال کی رعنائیوں میں اسقدر گم تھے کہ اسے اپنے تئیں عشاء کی اذان خیال کیا۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد روشنی پھیل گئی تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اپنا گریبان پکڑ لیا اور کہا اے عبداللہ! اے ظالم! اے بد بخت! تو کتنا بدنصیب ہے کہ تیری ساری رات دنیا کے حسن کی رعنائیوں میں بیت گئی اے ظالم! اگر خدا کی محبت میں تو اتنا ہی غرق ہو جاتا اور ساری رات اس کی یاد میں بسر کرتا تو تیرے احوال کی کیفیت کچھ اور ہی ہوتی۔ عبداللہ بن مبارک روتے رہے اور روتے روتے سجدہ میں گر پڑے اور حالت گریہ میں پڑے رہے۔ سجدے سے سر اس وقت اٹھایا جب کہ محبت الٰہی کا پودا کشت قلب میں جڑ پکڑ چکا تھا اور اس محبت نے پھر انہیں اس حسینہ سے بے نیاز کر دیا کیونکہ محبت الٰہی انسان کو خوددار اور غیرتمند بناتی ہے پھر وہ دنیوی حسینوں کی خاطر قلب و ذہن کو پریشان نہیں کرتا' اپنی راتوں کو محبوب حقیقی کی یاد میں رو رو کر گزارتا ہے اور اس دولت گریہ سے اس کی قلبی کیفیتوں میں انقلاب آ جاتا ہے' اس کے درجات بلند ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے دل کے تار بجتے ہیں تو صرف ذکر الٰہی پر ایک ایسے محبوب کے ذکر پر جس کی عنایات و نوازشات کا نظام انسان کو ہمہ وقت جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرتا ہے کہ

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

انسان کے اندر عشق و محبت کا جو فطری جذبہ رکھا گیا ہے۔ تصوف اسے جمال مصطفوی اور جلال و کمال خداوندی کی رعنائیوں کی طرف پھیر دینا چاہتا ہے۔ اگر انسان

کے جذبۂ محبت کو ایک مرکز مل جائے اس کی جمال تلاش نظروں کو جمال مصطفوی ﷺ کی رعنائیاں مل جائیں تو اس کے ساز قلب کے تار پھر کسی مذموم جذبہ عشق و محبت کے لئے نہیں بجیں گے بلکہ تصوف کا یہ مقصود اس کے دل سے دوسری تمام محبتوں کو جڑ سے اکھاڑ کر صرف اللہ کی محبت کا پودا اس کے دل میں اگائے گا اور پھر جوں جوں کیفیات حضوری بڑھتی جائیں گی۔

محبت کا یہ پودا تناور درخت بنتا چلا جائے گا وہ لوگ اللہ کی محبت میں اس طرح مگن ہو جاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی لذت، کوئی چاشنی، کوئی کشش اور کوئی نظارہ انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔ انہیں لطف و راحت ملتی ہے تو صرف ذکر محبوب حقیقی میں کہ

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

پھر اس محبت کی کیفیتیں یہ ہو جاتی ہیں کہ انسان ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو جاتا ہے جیسے کہ انسانیت کے نمونۂ کمال حضرت رسول اکرم ﷺ سے فرمان الٰہی ہے کہ

وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

(المزمل، ۷۳: ۸) سب کچھ چھوڑ کر اسی کے ہو جایئے

کیونکہ محبت بڑی غیور ہوتی ہے وہ شرک کو نہ پسند کرتی ہے نہ قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

محبت الٰہی امتحان لیتی ہے۔ تقاضا کرتی ہے کہ اپنی محبوب ترین شخصیات اور معاملات کو اللہ کی خاطر چھوڑ دو تاکہ کسی غیر کی محبت کا تصور بھی تمہارے دل میں موجود نہ رہے اور اگر کسی گوشے میں کسی اور کی محبت کا ایک ذرہ بھی رہ گیا تو محبت ناقص رہ جائے گی کامل نہ ہو پائے گی۔ اسی لئے صاف لفظوں میں نبی اکرم ﷺ کی زبان

مبارک سے تقاضا کیا گیا کہ:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

(التوبہ ۹: ۲۴)

(اے محبوب ﷺ) فرما دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے ماں باپ اولاد' بھائی' بیویاں' رشتہ دار اموال تجارت جن میں خسارے کا فکر کرتے ہوں اور تمہارے پسندیدہ مکانات تمہیں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو پھر اللہ کے حکم (عذاب) کا انتظار کرو۔

اس تقاضا کا ایک مقصود یہ بھی ہے کہ انسان اپنے حقیقی کمال کو حاصل کر لے جو کہ بدون ہر طرف سے قولاً و فعلاً کٹ کر صرف اس کا ہو جانے کے بغیر حاصل نہیں ہو پاتا۔

اللہ کی محبت میں غرق ہو جانے کا یہی وہ مقام ہے جس کا ذکر سورہ آل عمران میں یوں ہوا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

(آل عمران ۳: ۹۲)

(لوگو) تم نیکی (میں کمال) ہرگز حاصل نہ کر سکو گے جب تک اپنی پیاری چیزوں سے کچھ (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو۔

یہاں "البر" کا ایک مفہوم محبت الٰہی میں کمال پانا بھی ہے اور یہ کمال اس وقت تک محال ہے جب تک اللہ کی محبت انسان کو دنیا کی ہر شئے کی محبت اور چاہت سے بے نیاز نہ کر دے اس امر کی تائید اور محبت خدا و رسول کی وحدت کی توثیق حدیث نبوی سے بھی ہوئی ہے۔

لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس

تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اپنے والد'

اَجْمَعِیْنَ　　　　　اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ

(صحیح بخاری، ۱:۷)　　　　　ہو جاؤں۔

گویا ایمان کامل کا تحقق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان عشق ومحبت میں توحید کے تقاضے پورے نہ کرے اس محبت کی علامات بھی قرآن حکیم نے بیان کر دی ہیں۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ　　　　　(عاشق لوگ تو وہ ہیں کہ) شب کے

(السجدہ ' ۳۲:۱۶)　　　　　راحت کدوں میں بھی ان کے پہلو بچھونوں سے جدا رہتے ہیں۔

دوسری جگہ پر ان احوال کی منظر کشی اس انداز میں کی گئی۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ　　　　　وہ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے الغرض ہر حالت

عَلٰی جُنُوْبِھِمْ　(آل عمران ' ۳:۱۹۱)　　　　　میں اللہ کی یاد میں مگن رہتے ہیں۔

۲۔ رضائے الٰہی

محبت الٰہی کا نقطہ کمال یہ ہے کہ انسان اللہ کی رضا پر راضی ہو جاتا ہے۔ رضائے الٰہی کا تحقق تصوف کا پانچواں مقصد اور تعلیم تصوف کا پانچواں مرحلہ ہے یہاں اللہ کے محب کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بمصداق آیت قرآنی۔

تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ　　　　　اے دیکھنے والے تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ

اللّٰہِ وَ رِضْوَانًا　(الفتح ' ۴۸:۲۹)　　　　　کبھی رکوع اور کبھی سجود میں ہیں ہر طرح اللہ سے اس کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہیں

ان کی سعی وکاوش ' عبادت اور شب بیداریاں ان سب کا مقصد وحید

رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے ان کی عبادت کا محرک خواہش جنت نہیں ہوتی۔ وہ اس لئے گریہ وزاری نہیں کرتے کہ دوزخ سے نجات پا جائیں بلکہ وہ محبوب حقیقی کو راضی کرنا چاہتے ہیں ان کی دعا کا تتمہ یہ ہوتا ہے کہ

طلب حسن تو ہے حسن طلب مل جائے

ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی دولت رضائے الٰہی ہے اور ان کے اس نظریئے کی تائید وتوثیق خود قرآن فرماتا ہے۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (التوبہ '۹: ۷۲) — اور اللہ کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت ہے۔

ان کا ذکر نیم شبی' مراقبے اور سرور محض اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ رکوع و سجود کا محرک خدائی محبت' اس کے جلووں کا نظارہ اور اس کی رضا کی طلب ہوتی ہے۔

مجھے ہوش کب تھی رکوع کی مجھے کیا خبر تھی سجود کی
ترے نقش پا کی تلاش تھی جو میں جھک رہا تھا نماز میں

تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی تمام کاوشوں کو' تمام توجہات اور تمام ترلمحات کو حصول رضائے الٰہی میں کھپا دو۔ خدا تمہیں جس حال میں بھی رکھے تمہارے دل میں شکوہ کا خیال تک نہیں آنا چاہیے۔ بندہ اپنی ہستی کو اس طرح سپرد رضائے الٰہی کر دے جیسے کہ مردہ غسال کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ تصوف و طریقت کی آرزو کرنے والے جب تک مردہ کی طرح خود کو غسال کے سپرد نہ کریں اس وقت تک تصوف و طریقت کے معارف و رموز سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ غسال مردے کو جس سمت چاہے کر دے' الٹا کر دے یا سیدھا مردہ اپنے ارادہ واختیار سے دستبردار ہو گیا اب مردہ کے باب میں جو ارادہ واختیار نافذ ہو گا وہ صرف غسال کا ارادہ ہو گا۔ مرد مومن تصوف کے پانچویں مرحلہ میں آکر اپنی ذات کو اور اپنے تمام امور ومعاملات کو سعی و کاوش اور تگ و دو کے بعد ان کے نتیجہ و انجام کو ذات باری کی پسند وناپسند کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر اس کا جو انجام محبوب کو منظور ہو وہی پر لطف اور مسرت انگیز ہوتا ہے۔

دو بزرگوں کی ملاقات ہوئی ایک نے دوسرے سے حال دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا حضرت! مل جائے تو شکر کرتے ہیں نہ ملے تو صبر کرتے ہیں۔ یہ مقام صبر و شکر تھا۔

دوسرے بزرگ نے احوال دریافت کیے تو جواب ملا! حضرت مل جائے تو بانٹ دیتے ہیں نہ ملے تو شکر کرتے ہیں۔ یہ مقام رضا ہے اور مقام رضا کا تقاضا یہ ہے کہ ذات باری اگر دینے میں خوش ہو تو بندہ اس حال میں شاداں و فرحاں رہے۔ اگر تکلیف بھی آئے تو اسے مسرت ہو کہ یہ تحفہ محبوب کا عنایت کردہ ہے۔ اہل دل کے پاس موت کا فرشتہ آتا ہے تو مسکراتے ہیں کہ یہ محبوب کا قاصد ہے اور موت دراصل محبوب کی طرف سے دعوت وصل ہے۔۔ یہی سبب ہے کہ وقت مرگ مرد مومن کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے۔

نشان مرد مومن باتو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

اگر ان کے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا جائے تو ان کے لبوں پر حرف شکایت نہیں آتا۔

مجنوں کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ لیلیٰ بیمار ہو گئی۔ مجنوں کو پتہ چلا تو بے قرار ہو کر اس کے شہر چلا آیا اور چھپ گیا کہ کہیں لیلیٰ کو اس کے آنے کی خبر نہ ہو ورنہ اس طرح محبت میں بے غرضی کی شدت برقرار نہیں رہے گی اور لوگوں کو پتہ چل جائے تو محبوب کی رسوائی ہو گی۔ طبیبوں کا فیصلہ تھا کہ لیلیٰ کو خون دیا جائے ورنہ وہ جانبر نہ ہو سکے گی۔ مجنوں نے لیلیٰ کو خون دیا۔ جس کے باعث وہ صحت یاب ہو گئی۔ لیلیٰ نے اپنی صحت یابی کی خوشی میں جشن منایا اور کچھ پکوا کر شہر میں اعلان کروا دیا کہ تمام فقراء اور محتاج اس کے در پہ آئیں کہ وہ شکرانے کے طور پر کچھ تقسیم کرنا چاہتی ہے لوگ آئے اور قطاروں میں لگ گئے۔ فقراء کی اسی قطار میں مجنوں بھی اپنا کاسہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ ہر کوئی اپنا کاسہ بڑھاتا اور اپنا حصہ لے کر چل دیتا تا آنکہ مجنوں کی باری

آئی اس نے اپنا کاسہ محبوب کے دست عطا کے آگے کیا تو لیلیٰ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ یہ مجنوں ہے لیلیٰ نے بجائے کچھ دینے کے اوندھا ہاتھ مارا کاسہ نیچے گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

بظاہر تو ساری دنیا کے سامنے مجنوں کی رسوائی ہو گئی لیکن وہ ناراض ہونے کی بجائے زمین پر بیٹھا کاسہ کے منتشر ٹکڑے اٹھا رہا تھا اور انہیں چوم چوم کر آنکھوں پہ رکھتا۔ ساتھ ہی وجد میں آکر ناچتا اور لیلیٰ کے گن گاتا۔ کسی نے کہا اے مجنوں! تجھ جیسا بے وقوف بھی کوئی ہے؟ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی پر لیلیٰ خوش ہوئی اور اسے کھانا عطا کیا لیکن تیری بے عزتی ہوئی کھانا بھی نہ ملا اور کاسہ بھی توڑ دیا اور تو بجائے رنج و ملال کے خوش ہو کر ناچ رہا ہے؟ مجنوں نے کہا ناداں! اس راز کو تو نہیں جانتا۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ آخر کوئی امتیازی بات ہے کوئی خاص بات ہے کہ لیلیٰ نے میرے ساتھ یہ منفرد سلوک کیا ہر ایک کو کھانا دیا لیکن میرے ساتھ امتیاز برتا اور کاسہ بھی توڑ دیا۔ اسی سے ثابت ہوا کہ لیلیٰ کے ساتھ میرا تعلق کسی اور نوعیت کا ہے' وہ میری نسبت کوئی اور تصور رکھتی ہے اسی نسبت اور تعلق کا فخر تو مجھے وجد میں لاتا ہے اور میں خوش ہو کر ناچتا ہوں محبوب کا کاسہ توڑ دینا اس کی عنایت و محبت پر دلالت کرتا ہے اگر وہ مجھے عام لوگوں کی طرح سمجھتی تو یہ امتیازی سلوک کیوں کرتی؟

اہل محبت و اہل رضا پر جب تنگی' مصیبت اور تکلیف آتی ہے تو وہ اسے محبوب کی عنایت و نوازش خاص خیال کرتے ہیں' تکلیف آئے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ اے محبوب! تیرا شکریہ تو نے تکلیف دی جو اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ تو نے ہمیں اپنی یادوں میں جگہ دی اس سے بڑی عنایت اور کیا ہو سکتی ہے اگر اذیت و مصیبت پر حرف شکایت زبان پر آجائے تو یہ محبت کے ناقص ہونے کی دلیل ہے یہی سبب ہے کہ اہل دل شکوہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے بقول غالب

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

مقام رضا، دراصل وہ کیفیت عظمیٰ ہے جو توکل سے بھی بلند ہے، صبر سے بھی بلند ہے، اور یہ مقام تفویض سے بھی بلند ہے۔ مقام رضا یہ ہے کہ محبوب محب کو جس حال میں بھی رکھے خوش رہے اسے تکلیف بھی ہو تو وہ راحت کا سامان بن جائے۔

تصوف کے سلسلہ تعلیم کا پانچواں سبق یہ ہے کہ شکوہ وشکایت کی دنیا سے نکل کر اپنے فرائض ادا کرو جدوجہد اور تگ ودو کرو لیکن انجام اللہ کے سپرد کردو یہ مقام تفویض ہے اور جب انجام سامنے آجائے تو جو بھی انجام ہو اس پر راضی ہو جائے۔ آئینہ قلب پر گرد ملال نہ پڑنے پائے۔ یہی مقام رضا ہے اور جب کسی ذہنی و قلبی کیفیات عملاً مقام رضا پر پہنچ جائیں تو وہ تعلیمات ومقاصد تصوف کے پانچویں مرحلہ کو طے کرجاتا ہے۔

۳۔ معرفت ذات الٰہی

جب بندہ مرحلہ رضا کو طے کرلیتا ہے تو حجابات مرتفع ہونے لگتے ہیں، ذات الٰہی کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ پھر ہر شئے میں اسے ذات الٰہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اگر رضا ومعرفت کا عملی نظارہ کرنا مقصود ہو تو صدیق اکبر کی کیفیات جذب وعشق کو سامنے رکھا جائے۔

غزوہ تبوک کے موقع پر جب نبی اکرم ﷺ نے جہاد بالمال کا اعلان فرمایا تو صدیق اکبرؓ نے گھر کا تمام سامان لاکر آپ کے قدموں میں ڈھیر کردیا حتی کہ خود اپنے لئے ایک کپڑا تک نہ چھوڑا اور خود بوریا میں ملبوس ہوکر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

آپ ﷺ نے پوچھا:

ما ابقیت لاھلک — تو نے اپنے گھر والوں کے لئے باقی کیا چھوڑا ہے؟

آپ نے عرض کی:

ابقیت لھم اللہ و رسولہ   میں ان کے لئے اللہ اور رسول ﷺ چھوڑ آیا ہوں۔

یہی مقام تفویض و رضا تھا کہ گھر والوں کے لئے صرف خدا اور اس کے پیارے رسول ﷺ کی نسبت چھوڑ آئے۔ گویا آپ کو سامان دنیا کی نہیں بلکہ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حاجت تھی یہ مقام رضا تھا جس کا صلہ یہ تھا کہ جس لباس میں صدیق اکبر تشریف لائے تھے اسی لباس میں جبریل امین بھی بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا۔ اے جبریل! آج تو نیا لباس پہن کر آیا ہے تجھے میں نے اس سے قبل اس لباس میں نہیں دیکھا!

جبریل علیہ السلام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ذرا نظروں کو اوپر اٹھائیں میں تو کیا۔ تمام قدسیان فلک نے یہی لباس زیب تن کیا ہوا ہے۔

یہ مقام قابل غور ہے کہ جو اپنا سب کچھ راہ خدا میں لٹا کر مقام رضا پر پہنچا اس کی ادا خدا کو اس قدر پسند آئی کہ اس کے عشق و محبت سے لبریز عمل کا جشن خود خدا تعالیٰ نے منایا اور تمام فرشتوں کو یہ حکم فرما دیا کہ تم بھی وہی لباس پہنو کہ آج یہ لباس ہمارے ساتھ عشق و محبت کی دلیل بن چکا ہے۔

جبریل امین علیہ السلام نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اللہ نے آپ کی بارگاہ میں اس لئے بھیجا ہے کہ آپ کی وساطت سے صدیق اکبرؓ تک اللہ کی طرف سے سلام پہنچا دوں اور اللہ سبحانہ پوچھتے ہیں کہ اے صدیق! تو اللہ کی رضا میں سب کچھ لٹا کر ہم سے خوش ہے یا ناراض!

جب نبی اکرم ﷺ نے صدیق اکبرؓ سے دریافت فرمایا تو آپ لرزہ براندام ہو گئے' رقت طاری ہو گئی اور وجد میں آ کر زار و قطار روتے ہوئے پکار اٹھے ابو بکرؓ اور اللہ سے ناراض؟ میں تو سب کچھ پیش کر کے بھی اس فکر میں ہوں کہ وہ مجھ سے راضی ہوا ہے یا نہیں! مجھے تو صرف یہ مژدہ سنا دیجئے کہ اللہ رب العزت مجھ پر راضی ہو گئے ہیں۔

صدیق کے لئے اس سے بڑھ کر مقام رضا اور کیا ہو گا جب مرد مومن مقام رضا پر فائز ہو جاتا ہے تو پھر اللہ رب العزت ہمہ وقت اس کی رضا چاہتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جسے علامہ اقبالؒ نے خوبصورت شعر کے قالب میں ڈھالا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تصوف کا مدعا یہ ہے کہ بندہ نابینا نہ رہے بلکہ بینا ہو جائے اسے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی عطا ہو۔ دل تو ہر ایک کو نصیب ہے لیکن

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
کہ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

قرآن حکیم نے اس فلسفہ کو خوب بیان فرمایا ہے۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ

(الاعراف، ۷: ۱۷۹)

ان کے دل ہیں لیکن وہ اس سے (قرآن وحدیث میں) فکر نہیں کرتے اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ ان سے (اخلاق محمدی) دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں لیکن ان سے (وہ حضور کا بیان) سنتے تک نہیں (عمل کرنا تو درکنار) یہ لوگ جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی بے راہ ہیں (مقصد حیات سے ناواقف جہل میں مبتلا ہیں) یہی لوگ غافل ہیں۔

گویا ان تمام اعضاء کے صحیح و سالم ہونے کے باوجود ان کی بصارت نور بصیرت سے محروم ہے' اس کی سماعت حقیقت تک پہنچنے سے معذور ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دل رکھتے ہیں مگر کچھ سمجھتے نہیں ان کے قلب پر انوار و تجلیات ضوفشاں نہیں ہوتے کیونکہ ان کے قلب زنگ آلود ہیں وہ تمام عقدوں کو عقل کے زور سے

کھولنا چاہتے ہیں جبکہ حقیقت کے عقدے قلب کی کنجی سے وا ہوتے ہیں۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

انہیں دل میسر ہیں لیکن محض گوشت کا لوتھڑا یا گردش خون کا محور' اس سے زیادہ کچھ نہیں' ان کے قلوب اس حقیقت۔ محروم ہیں کہ

دل گزر گاہ جلیل اکبر است
از ہزار ان کعبہ یک دل بہتر است

آنکھیں بصارت چاہتی ہیں' کان سماع چاہتے ہیں نو۔ یں دل بینا کے بغیر یہ سب کچھ کہاں میسر آ سکتا ہے؟ دل بینا حاصل ہو جانا معرفت الٰہی کا پا جانا ہے۔ معرفت الٰہی کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ جب میں پہلی مرتبہ حج پر گیا تو کعبہ نظر آیا' میں نے سمجھا کہ میرا حج قبول نہیں ہوا۔ جب میں دوسری دفعہ گیا تو کعبہ کے ساتھ کعبہ والا بھی نظر آیا۔ پھر میں نے اللہ سے التجا کی اے مولا! تو مجھے شرک سے نجات دے کہ تجھے بھی دیکھ رہا ہوں اور ساتھ تیری مخلوق کو بھی دیکھ رہا ہوں! گویا ابھی میں شرک کی آلائشوں سے مکمل طور پر پاک نہیں ہوا۔ فرمایا جب میں تیسری دفعہ حج کے لئے گیا تو زمین بوس ہوا اب مجھے صرف کعبے والا دکھائی دے رہا تھا نہ کعبہ نظر آ رہا تھا۔ نہ باقی مخلوق۔ میں نے عرض کیا۔

باری تعالیٰ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے حقیقت توحید سے آشنائی عطا کی آواز آئی۔ بایزید! صرف کعبے والے کو دیکھ کر تو حقیقت توحید کو نہیں پا سکتا تا آنکہ تو اپنے آپ کو بھی نہ دیکھ سکے اور تجھے ہر جگہ صرف میں ہی نظر آؤں اس وقت سمجھنا کہ تجھے حقیقت توحید کی سمجھ آ گئی ہے۔ بقول غالب

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

جب انسان معرفت الٰہیہ پاتا ہے تو ظلمات جہاں کے حجاب مرتفع ہو جاتے

ہیں۔ دل دنیا و مافیہا سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ خلق کالعدم ہو جاتی ہے اور ہر طرف خالق ہی خالق نظر آتا ہے۔

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

اور بمصداق آیت قرآنی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ ۲: ۱۱۵) پس تم جس طرف رخ کرو وہیں اللہ متوجہ ہے۔

انسان جس سمت نظر کرتا ہے ذات الٰہی جلوہ گر نظر آتی ہے اس کی نگاہ اس حقیقت کو بالفعل دیکھتی ہے کہ

کل شئی ھالک الا وجھہ

پھر اس کی نظروں کے سامنے ہر شئے ہالک اور معدوم ہو جاتی ہے:

تصوف' ان چھ تعلیمات و مقاصد سے عبارت ہے۔ برائے استحضار واضح رہے کہ تصوف کا پہلا قدم تزکیہ نفس ہے۔ دوسرا قدم صفائے قلب ہے۔ تیسرا قدم اطاعت حق ہے چوتھا قدم محبت الٰہی ہے۔ پانچواں قدم رضائے الٰہی ہے اور چھٹا قدم معرفت الٰہی ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے یہ حالت تھی کہ جب کبھی اس کی تلاش میں نکلتا اپنے سوا کچھ نہ پاتا۔ لیکن اب اس کے سوا کچھ نہیں پاتا' س کا سبب یہ ہے کہ جب انسان تعلیم تصوف کے نقطہ کمال معرفت الٰہی تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی نظروں کے سامنے سے فنا کے سارے کے سارے پردے معدوم ہو جاتے ہیں اور ظاہر و باطن میں صرف وہی ذات والاصفات باقی رہ جاتی ہے۔

گذشتہ تمام بحث میں کسی ایک مقام پر بھی جمود و تعطل یا رہبانیت کا کوئی تصور موجود نہیں' تصوف محض اللہ اللہ کئے جانے میں محدود نہیں بلکہ یہ ایک پیغام عمل' پیغام انقلاب اور پیغام حرکت ہے۔

تصوف دنیا کی محبتوں کو چھوڑ کر اس مقام کو پالینے کا نام ہے کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

جب انسان تعلیم تصوف کے ان مرحلوں کو طے کرتا ہے تو نقطہ کمال پہ جا کر اسے معرفت الٰہی نصیب ہوتی ہے۔

اس کا تعلق باللہ! استوار ہو جاتا ہے اور نسبت کا یہ اعزاز انسان کو ان عظمتوں سے ہمکنار کرتا ہے جن کا مقابلہ دنیا کی کوئی عظمت نہیں کر سکتی کیونکہ

نسبت نور تو خود نور بنا دیتی ہے

